بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

یکم دسمبر ۲۰۱۵ء کو ایک دلخراش اور اذیت ناک واقعہ رونما ہوا، جس نے پورے ہندوستان کو تشویش واضطراب بلکہ غم وغصے میں مبتلا کردیا، ہندوستان کی ایک انتہا پسند تنظیم ہندو مہا سبھا کے ایک شدت پسند لیڈر نے رسول اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی اور بیہودہ گوئی کرکے اشتعال انگیزی کی کوشش کی۔ اس خبر کا اخبارات اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے لوگوں کے کانوں تک پہنچنا تھا کہ پورے ہندوستان کے مسلمان سراپا احتجاج بن گئے، اور جلوس جلسے ومظاہرے کرکے مجرم کی گرفتاری اور اس پر فرد جرم عائد کرکے عبرتناک سزا دینے کا مطالبہ ہونے لگا، واقعہ چونکہ اتر پردیش کا تھا، اس لیے ریاستی حکومت نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے مجرم کی گرفتاری میں تاخیر نہیں کی، اور گرفتاری کرکے یہ باور کرادیا گیا کہ مجرم کو قید کے حوالے کرکے اس کو قرار واقعی سزا دے دی گئی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ شان رسالت مآب ﷺ میں بدزبانی، یاوہ گوئی اور زہر افشانی کرکے اشتعال دلانے، نفرت پھیلانے، ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے اور ملک کا ماحول خراب کرنے کی جو کوشش کی گئی تھی، اس کی پاداش میں مجرم کو جو سزا ملنی چاہئے تھی، ہماری اطلاع کے مطابق اس پر ابھی تک ایسی کوئی دفعہ نہیں عائد کی گئی ہے، جس کی سزا اس کے جرم کی طرح سنگین ہو، اور وہ دوسرے بدباطنوں کے لیے تازیانۂ عبرت بن سکے، یہی وجہ ہے کہ اس گستاخی کے بعد بھی کئی ایک واقعات اس طرح کی گستاخی کے پیش آچکے ہیں، اور ان مجرموں کو بدزبانی اور سبّ وشتم کی کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔

اس طرح کی مجرمانہ حرکتیں پہلے بھی ہوتی رہی ہیں، اور آج بھی آئے دن کوئی دشمن انسانیت کتوں کے بھونکنے کی طرح اٹھ کر بھونکنا شروع کردیتا ہے، جس سے سوائے ان کی دیوانگی، پاگل پن، اور بےعلمی وبےعقلی اور حواس باختگی کے کسی چیز کا اظہار نہیں ہوتا، توہین رسالت کے علاوہ اگر ان کا کوئی مقصد ہوسکتا ہے، تو وہ مسلمانوں کی ایذا رسانی، دل آزادی اور اشتعال انگیزی کے ساتھ ملک

میں مذہبی منافرت پیدا کرنا، اتحاد و یکجہتی کے تار و پود کو بکھیرنا، اور اس کی اس طاقت کو کمزور کرنا ہوسکتا ہے، جو اس کی جمہوریت، مذہبی رواداری اور باہمی یک جہتی میں مضمر ہے، اس لیے اگر کوئی دشمن عقل وخرد اس سنگین جرم کا ارتکاب کرتا ہے، تو اس کو کم از کم وہ سزا ضرور ملنی چاہئے جو ملک دشمن سرگرمیاں انجام دینے والے کی ہوتی ہیں، ورنہ تو حقیقت میں یہ جرم ایسا ہے کہ اس کے لیے سیدھے سیدھے سزائے موت کا قانون ہونا چاہئے۔

مسئلہ صرف اسلام اور مسلمانوں کا نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق بین الاقوامی مسائل سے ہے، دنیا کا کوئی مذہب یا کوئی دین دھرم ہو، نبی اور پیغمبر کی تو بہت بڑی بات ہے، میں نہیں سمجھتا کہ عام مذہبی رہنماؤں یا پیشواؤں کی شان میں گستاخی کرنے اور ان کی شخصیت کو مجروح کرنے کی اجازت دیتا ہو۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اس میں تو اس کو سختی سے منع کیا گیا ہے، پیغمبروں کو برحق ماننے کا عقیدہ تو دین اسلام کی اصل اور اساس میں داخل ہے، ان پر ایمان لانے اور ان کی پیغمبری کا اقرار کرنے کی اسی طرح تعلیم دی گئی ہے، جس طرح پیغمبر آخر الزماں جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے اور دوسرے پیغمبروں یا کسی ایک پیغمبر پر نہ لائے تو وہ اسلام کی نگاہ میں مومن نہیں ہوسکتا، اس لیے کوئی مسلمان تو کسی پیغمبر کے بارے میں غلط خیال بھی لانے کا کبھی تصور نہیں کرسکتا۔

اس قسم کی اشتعال انگیزی کے واقعات نہ صرف ملکی بلکہ عالمی سطح پر بہ کثرت ہونے لگے ہیں، اور یہ نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی غیرت وحمیت، بلکہ ان کے حلم وعقل اور ادراک وشعور کے لیے سخت ابتلا وآزمائش اور امتحان کے ہوتے ہیں۔ اس کے پس پردہ یہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرکے، ان کو احتجاج، مظاہرہ اور جلسہ وجلوس میں الجھا کر، ان کو مثبت رویے سے ہٹا کر، ان کے اندر منفی سوچ پیدا کردی جائے؛ ان کی ذہنی، عقلی اور عملی توانائی کو جلسوں اور مظاہروں تک محدود کرکے ان کو پوری طرح ضائع کردیا جائے، اور ترقی کی شاہراہ پر ان کو اس قدر پیچھے کردیا جائے کہ پسماندگی اور حرماں نصیبی ان کا مقدر اور ان کی زندگی کا لازمی عنصر بن کر رہ جائے، اور ذلت وپستی کے تاریک غار سے وہ کبھی باہر نہ نکل سکیں۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اغیار کے مقاصد کو سمجھیں، اور اس طرح کے مواقع پر اپنے ہوش وحواس بحال رکھ کر دشمنوں کی سازشوں اور کوششوں کو ناکام بنائیں، قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے احتجاج ومظاہرہ کی جو بھی

صورت ہو، اس کو اس طرح بروئے کار لانا چاہئے کہ امن وامان کو خطرہ نہ لاحق ہو، کیونکہ اگر اس کو خطرہ لاحق ہو گیا، تو دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔

یہ ضرور ہے کہ آنحضرت ﷺ کی محبت مسلمانوں کے رگ وریشے میں رچی بسی ہے، اور آپؐ کی شان میں کسی طرح کی کوئی گستاخی یا بے ادبی اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے، اور حب نبوی کا یہ تقاضا بھی ہے کہ ایک مسلمان آپؐ کے نام پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کردے؛ لیکن کیا اس محبت کا تقاضا صرف یہی ہے کہ توہین رسالت کا جب کوئی واقعہ پیش آئے تو سراپا احتجاج بن جائیں، جان کی بازی لگا دیں، اور بس۔ اور اسی کو اصل ایمان اور اسلام سمجھ لیں؟ کیا آنحضرت ﷺ صرف اتنے ہی کام کے لیے دنیا میں مبعوث ہوئے تھے اور پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے؟ کیا ہم اپنے عمل اور اخلاق وکردار سے روز وشب اور صبح وشام جناب رسول اللہ ﷺ کی روح کو تکلیف نہیں پہنچا رہے ہیں؟ کیا جب ہمارے اعمال آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش کیے جاتے ہوں گے، تو ہمارے کسی عمل سے بھی آپؐ کو کوئی خوشی حاصل ہوتی ہوگی؟ کیا آپ ﷺ جو جامع شریعت، جو تعلیم اور جو قرآن لائے تھے، اس کے کسی جز پر بھی ہمارا عمل ہے؟ کیا ہماری زندگی کا کوئی حصہ بھی-شکل وصورت سے لے کر عمل تک اور عبادات سے لے کر اخلاق وکردار اور معاشرت ومعاملات تک-آپؐ کی لائی ہوئی تعلیم کے مطابق ہے؟ ایک شخص ایک دفعہ ڈاڑھی تراش رہا تھا، ایک آدمی نے اس کو منڈواتے ہوئے دیکھ کر پوچھا کہ میاں! ڈاڑھی منڈا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ ڈاڑھی تراش رہا ہوں کسی کا دل نہیں تراش رہا ہوں، اس شخص نے کہا کہ کیوں نہیں؟ آنحضرت ﷺ کا دل چھلنی کر رہے ہو!!

یہ تو ایک مثال ہے، ورنہ درحقیقت ہم کو اپنے ہر عمل کو اسلام کی کسوٹی میں رکھ کر یہ غور کرنا چاہئے کہ کیا ہمارا کوئی عمل آپؐ کی تسکین قلب کا باعث ہے؟ کیا ہم ہمہ وقت آپؐ کے لائے ہوئے دین اور آپؐ کی دی ہوئی تعلیم کی دھجیاں نہیں بکھیر رہے ہیں؟ کیا ہم خود اسلام کے لیے باعث ننگ وعار نہیں ہیں؟ اور کیا ہم اس قابل ہیں کہ کل قیامت کے دن آپؐ کو منھ دکھا سکیں؟

....

اس مضمون کے آخر میں نہ صرف ہم سب کے شیخ المشائخ بلکہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی علیہ الرحمہ کے درس کی ایک گفتگو نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں، جس کو حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب ''احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن'' (۱۵۳-۱۵۵)

میں ذکر کیا ہے، اور جس کو تقریباً سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے، مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

''بخاری شریف کا سبق ہورہا تھا، مشہور حدیث گزری کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اس کے مال اور بال بچے اور سارے انسانوں سے زیادہ میں اس کے لیے محبوب نہ بن جاؤں .... فقیر ہی نے عرض کیا کہ بحمداللہ عام مسلمان بھی سرور کائنات ﷺ کے متعلق محبت کی اس دولت سے سرفراز ہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ ماں باپ کی توہین کو تو ایک حد تک مسلمان برداشت کرلیتا ہے........... لیکن رسالت مآب ﷺ کی ہلکی سی سبکی بھی مسلمانوں کو اس حد تک مشتعل کردیتی ہے کہ ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں، آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ جان پر لوگ کھیل گئے۔ سن کر حضرت نے فرمایا کہ ہوتا بے شک یہی ہے، جو تم نے کہا، لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟ تہہ تک تمھاری نظر نہیں پہنچی۔ محبت کا اقتضا یہ ہے کہ محبوب کی مرضی کے آگے ہر چیز قربان کی جائے؛ لیکن عام مسلمانوں کا جو برتاؤ آنحضرت ﷺ کی مرضی مبارک کے ساتھ ہے، وہ بھی ہمارے تمھارے سامنے ہے۔ پیغمبر ﷺ نے ہم سے کیا چاہا تھا اور ہم کیا کررہے ہیں، اِس سے کون ناواقف ہے؟ پھر سُبکی آپ کی جو مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت بن جاتی ہے، اس کی وجہ محبت تو نہیں ہوسکتی۔ خاکسار نے عرض کیا، تو آپ ہی فرمائیں اس کی صحیح وجہ کیا ہے؟

نفسیات انسانی کے اس مبصر حاذق نے فرمایا کہ سوچو گے تو درحقیقت آنحضرت ﷺ کی سُبکی میں اپنی سُبکی کا غیر شعوری احساس پوشیدہ ہوتا ہے، مسلمانوں کی خودی اور انانیت مجروح ہوتی ہے، ہم جسے اپنا پیغمبر اور رسول مانتے ہیں تم اس کی اہانت نہیں کرسکتے، چوٹ درحقیقت اپنی اسی ''ہم'' پر پڑتی ہے، لیکن مغالطہ ہوتا ہے کہ پیغمبر ﷺ کی محبت نے انتقام پر ان کو آمادہ کیا ہے، نفس کا یہ دھوکہ ہے، اپنی جگہ ٹھنڈے دل سے جو غور کرے گا، اپنے طرز عمل کے تناقض کے اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے۔ بہر حال محبوب کی مرضی کی جسے پرواہ نہ ہو، اذان ہورہی ہے اور لایعنی اور لاحاصل گپوں سے بھی جو اپنے آپ کو جدا کرکے مؤذن کی پکار پر نہیں دوڑتا، اسے انصاف سے کام لینا چاہئے کہ محبت کا دعوی اس کے منھ پر کس حد تک پھبتا ہے''۔

تفسیر سورۂ مطفّفین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

<u>ناپ تول میں خیانت کا اصل سبب:</u>

جب مطففین کے حال پر ''ہائے افسوس'' کہہ کر ڈانٹ پلائی تو اب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اس برائی کا ارتکاب اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے دل میں قیامت کا اعتقاد نہیں ہے، جس کا عقیدہ یہ ہو کہ قیامت کے دن جواب دہی ہوگی تو وہ مخلوق کی حق تلفی کی جرأت نہیں کرتا، بالخصوص ٹھگی، فریب اور مکاری سے لوگوں کے حقوق پامال نہیں کرسکتا، اسی لیے استفہام انکاری کے طور پر فرمایا:

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَبْعُوْثُوْنَo لِیَوْمٍ عَظِیْمٍo

کیا خیال نہیں رکھتے وہ لوگ کہ ان کو اٹھنا ہے اُس بڑے دن کے واسطے یعنی عقل وشعور سے دور افتادہ یہ لوگ گمان بھی نہیں کرتے۔

''ظن'' کا لفظ گمان کے معنی میں آتا ہے، اس موقع پر یہ لفظ لاکر بتلانا یہ ہے کہ ہر عقلمند آدمی اس عقیدے پر مکمل یقین رکھتا بلکہ ہر لحہ یہ عقیدہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، مگر یہ احمق لوگ تو اس عقیدے کا گمان بھی نہیں رکھتے یقین تو دور کی بات ہے۔

دوسرے یہ لفظ لانے میں اس طرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس دن کا اگر یقین نہ ہو صرف گمان بھی ہو، تو اس طرح کے خطرات کے گمان سے بھی حفاظتی انتظام کیا جاتا ہے، چنانچہ مسافر راستے کی مشکلات کے صرف گمان پر ہی ضروری حفاظتی بندوبست کرلیتا ہے، مگر یہ نادان لوگ تو اس کا گمان بھی نہیں رکھتے۔

''**لیوم عظیم**'' اس دن کی عظمت و بڑائی اس وجہ سے ہے کہ اس دن عدل وانصاف قائم ہوگا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کا مطالبہ ہوگا، مخلوق کے حقوق دبانے، تلف کرنے والوں سے نہایت سختی سے نمٹا جائے گا، اور اس دن کی عظمت کا سبب یہ بھی ہے کہ وہ رسوائی کا دن ہوگا، اس لیے کہ اس کی صفت یہ بھی ہے:

يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَo

جس دن کھڑے رہیں گے لوگ راہ دیکھتے جہان کے مالک کی

یعنی اس دن تمام اگلے پچھلے لوگ اللہ رب العزت کے سامنے کھڑے ہوں گے، یہاں پر اسمِ ذاتی (اللہ) کی بجائے رب العالمین کا صفتی نام ذکر فرمایا ہے، اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس کی ربوبیت عامہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اپنے تمام بندوں کو ان کا پورا پورا حق پہنچائے، سو جن لوگوں نے دوسروں کے حقوق پامال کیے ان کا اللہ تعالیٰ کے روبرو کھڑا ہونا کمال درجے کی ذلت ورسوائی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے رہنے کی مدت:

بعض مفسرین نے کھڑے ہونے سے مُردوں کا زندہ ہونا مراد لیا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: فلاں شخص نیند سے اُٹھ گیا، یعنی بیدار ہوگیا، لیکن صحیح ترین بات یہ ہے کہ یہاں کھڑے ہونے سے حقیقی معنی میں کھڑا ہونا مراد ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ قیامت کے دن تین سو برس کے برابر میدانِ حشر میں کھڑے رہیں گے، اس عرصہ میں ان کو کوئی حکم نہیں ملے گا، لیکن یہ طویل ترین مدت مؤمنین کو اتنی معلوم ہوگی جتنی دیر میں نماز سے فراغت ہوتی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت مقداد بن الاسود کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ''یقوم الناس فی رشحهم إلى أنصاف آذانهم''

لوگ اس حال میں کھڑے ہوں گے کہ پسینہ ان کے کانوں کی لَو تک ہوگا۔

صحیح مسلم اور دوسری کتب صحاح میں یہ بھی مروی ہے کہ قیامت کے دن سورج ایک یا دو کوس کی بلندی پر ہوگا، اس کی گرمی سے لوگ پگھلنے لگیں گے، پسینے سے شرابور ہوجائیں گے، البتہ اپنے اپنے برے اعمال کے مطابق ان کو تکلیف اور پسینہ ہوگا، چنانچہ بعض کا پسینہ گردن تک ہوگا، بعض کا کان کی لَو تک پہنچ کر منھ میں لگام کی طرح رہے گا، اور کسی کے سینے تک، کسی کی کمر تک، کسی کے زانو تک، اور کسی کے ٹخنوں تک ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں روایت ہے کہ ایک دن نماز میں انھوں نے یہ سورت شروع کی، جب اس آیت پر پہنچے تو شدتِ خوف سے آنکھیں چھلک پڑیں، یہاں تک کہ بے تاب ہو کر گر پڑے اور اس وقت نماز نہ پڑھ سکے۔

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍo

ہرگز نہیں، بیشک اعمال نامہ گنہگاروں کا سجین میں ہے

یعنی ناپ تول میں کمی کرنے والوں کو چاہئے کہ یہ حرکت چھوڑ دیں، اور قیامت کے دن زبردست عادل کے سامنے کھڑے ہونے سے غافل نہ رہیں، ان کا ہر اچھا یا برا عمل اعمال نامے میں لکھا ہوا ہے پھر وہ اعمال نامے ان فرشتوں کے سپرد ہیں جو ان اعمال ناموں کو بڑے دفتر (سجین) میں داخل کرتے ہیں، لہذا مخلوق کے جو حقوق بھی انھوں نے تلف کیے اس دفتر کے مطابق ان سے باز پُرس ہوگی۔ اور اگر وہ پوچھیں کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارے اعمالنامے کہاں محفوظ ہوں گے؟ ان کو پہچاننے کی کیا علامت ہے؟ تو ان سے کہہ دیجیے "إن كتاب الفجار لفی سجين" کہ بدکاروں کے اعمالنامے ان کے ناموں کے ساتھ سجین کے دفتر میں ہیں۔

"سجین کی تحقیق":

سجین، سجن سے مبالغے کا صیغہ ہے، سجن قید خانے کو کہتے ہیں، وہ جگہ جہاں اس دفتر (فائل) میں اندراج ہوتا ہے، وہ نہایت تنگ و تاریک جگہ ہے، دوزخیوں کی ارواح کا قید خانہ بھی وہی ہے، اسی لیے اس دفتر، فائل، رجسٹر کا نام بھی سجین رکھ دیا، چنانچہ مزید اس کی تحقیق بیان فرماتے ہیں:

وَمَا اَدْرٰكَ مَا سِجِّیْنٌo

اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے سجین

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌo

ایک دفتر ہے لکھا ہوا

یعنی سجین ایک دفتر (رجسٹر، فائل) ہے، جس میں ہر دوزخی کا نام درج ہوتا ہے اور بندوں

کے عمل لکھنے والے فرشتے جن کا ذکر اس سے پہلی سورت میں آچکا ہے، ان بدکاروں کے مرنے اور ان کے عمل منقطع ہونے کے بعد ہر شخص کے اعمال علیحدہ علیحدہ فردوں (کاغذوں) میں لکھ کر اس بڑے دفتر (رجسٹر، فائل) میں داخل کرتے اور پھر اس فرد پر یا ہر ایک دوزخی کے نام پر ایک علامت بنا دیتے ہیں، جس کے دیکھتے ہی معلوم ہو جائے کہ یہ شخص دوزخی ہے۔

اصل لغت میں ''رقم'' اس علامت کو کہتے ہیں جو کپڑے کی تجارت کرنے والے کپڑے کے تھان پر لگا دیتے ہیں، تاکہ فروخت کرتے وقت اس کی قیمت کی پہچان رہے۔

سجین کے متعلق بعض ضعیف احادیث میں مزید تفصیل آئی ہے، چنانچہ کعب احبارؓ سے روایت ہے کہ سجین کے نام سے جو دفتر موسوم ہے وہ ساتوں زمینوں کے نیچے ہے، وہاں ایک سیاہ پتھر پڑا ہے، اس سے بدبو اور دھواں نکل رہا ہے، جو شیطان اذکار وانوار سے بھاگتے ہیں وہ اسی جگہ جا کر ٹھہرتے ہیں، بدکاروں کی روح قبض کرنے کے بعد آسمانوں پر لے جائی جاتی ہے، مگر آسمان کے دربان جب اس کے لیے دروازے نہیں کھولتے تو واپس زمین پر اس کو لایا جاتا ہے، یہاں بھی اس کے لیے جب کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا تو آخر کار ساتوں زمین کے نیچے اسی پتھر کے نیچے اس کو رکھا جاتا ہے، جو فرشتے اس دفتر (سجین) پر مقرر ہیں وہ اس کا نام اس دفتر میں لکھ لیتے ہیں کہ فلاں بن فلاں اس تاریخ کو دنیا سے برزخ میں پہنچا اور یہ یہ اعمال ساتھ لایا، اور اس کے اعمال کی فردیں (فہرستیں) کراماً کاتبین کے روزنامچے سے لے کر اس دفتر میں داخل کر دیتے ہیں تاکہ قیامت کے دن یہ سب اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے، اور بدکاروں کی روحیں اسی جگہ رکھی جاتی ہیں اور ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔

علم معانی کے مطابق پیدا ہونے والے دو سوالوں کا جواب:

علم معانی کے قواعد کے مطابق یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ فجار کے دفتر کا ذکر یہ ایک ابتدائی خبر ہے، سننے والے جس سے ناواقف اور خالی الذہن ہیں، پہلے اس کا ذکر انھوں نے نہیں سنا اور علم معانی کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلی مرتبہ جو بات بیان کی جائے کہ اس سے پہلے سننے والا جس سے بے خبر ہو اس میں تاکید نہیں لایا کرتے، تو یہاں دو تاکیدیں کیوں ذکر کی گئی ہیں ایک ''اِنّ'' اور دوسری ''لام تاکید'' ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ سننے والے اگر چہ اس بات سے ناواقف تھے کہ فجار کے اعمال کا دفتر

سجین میں ہے، مگر اس کے اثبات سے اصل دفترِ اعمال کے وجود کا اثبات لازم آتا ہے اور اس کا کفار شدت سے انکار کرتے تھے، اس لیے کہ وہ سرے سے قیامت اور جزا وسزا کے ہی قائل نہیں تھے، تو ان کے اس شدید انکار کے مطابق بہت مضبوط وقوی تاکید لائی گئی، جو عین قاعدہ کے مطابق ہے، اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے، مثلاً کسی ایسے شخص کے سامنے جو زید کے وجود کا ہی منکر ہو، یوں کہا جائے "إن زيداً لفي دارِ فلان" تو یہ بالکل قاعدے کے مطابق درست ہے، اگر چہ سننے والا اس فلاں شخص کے گھر کو جانتا ہو نہ اس کا کبھی نام ہی سنا ہو۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ سجین کا جب پہلے ذکر ہو چکا تو "وَمَا اَدْرٰکَ مَا سِجِّيْنٌ" میں سجین کو لام عہد کے ساتھ معرف باللام لانا چاہئے تھا اور یوں کہنا چاہئے تھا "ما ادراک ماالسجين" جیسے "كَمَا اَرْسَلْنَا إِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلاً ٥ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ" میں الرسول ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں سجین کا لفظ سننے والے اس کے معنی سے بالکل ناواقف ہیں، گویا اس کا ذکر کرنا نہ کرنا دونوں برابر ہے، لہٰذا اس کو جب دوبارہ ذکر کیا تو اس کو نکرہ لانا ہی مناسب ہوا، گویا یوں فرمایا "اور تم کیا جانو کہ وہ سجین مجہول جس کا ابھی تک معنی معلوم نہیں ہوا وہ کیا ہے"۔

اس کے مقابلے میں رسول کا لفظ سنتے ہی عربی زبان سے واقف لوگ اس کا معنی سمجھ جاتے ہیں، اس لیے اس کو دوبارہ ذکر کرتے ہوئے معرف باللام لانا ہی مناسب ہے۔

اہل نظم کے ایک شبہے کا جواب:

اہل نظم کو یہاں ایک شبہہ ہوتا ہے کہ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ ہر جگہ نیک وفرمانبردار لوگوں کا ذکر پہلے ہوتا ہے اور بدکاروں نافرمانوں کا ذکر بعد میں ہوتا ہے، اور نیک لوگوں کے مقام وعظمت کے مناسب بھی یہی ہے کہ ان کا ذکر پہلے ہو، لیکن یہاں کس وجہ سے بدکاروں کا ذکر پہلے اور نیکوکاروں کا بعد میں ہوا؟

جواب اس کا یہ ہے کہ اس سورت کی ابتداء ہی سے مطففین کے متعلق کلام شروع ہوا جو بدکاروں کا ایک گروہ ہے اور اس موقع کے لحاظ سے مناسب یہی ہے کہ ان کے ڈرانے کے لیے بغیر وقفہ کیے سب سے پہلے بدکاروں کے دفتر کا ذکر کیا جائے، ورنہ درمیان میں دوسری بات شروع ہو جانے سے یہ مقصد اچھی طرح حاصل نہیں ہوسکتا، اور موقع ومقام کی رعایت کرنا شرافت ومرتبہ کی

رعایت سے زیادہ اہم ہے۔

جب اس آیت میں بدکاروں کا حال مطلقاً بیان ہوا اور یہ بھی ذکر ہو چکا کہ ناپ تول میں خیانت کرنے والے آخرت کا اعتقاد نہیں رکھتے، تو اب ترقی کر کے اور آگے بڑھ کر قیامت کا انکار کرنے والے لوگوں کا ذکر کرتے ہیں، تا کہ مطففین کی سرزنش اچھی طرح سے ہو سکے، فرمایا:

وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَo

خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی

یعنی جس دن کہ اس دفتر (سجین) کو کھول کر ہر ایک کو اس کے اعمال بتائے جائیں گے، اس دن جائے بربادی ہے ان منکرین کے حال پر جو اس دن کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے، اور یہ گمان کرتے تھے کہ لوگوں کے حقوق کا ان سے حساب نہ لیا جائے گا، اس لیے کہ ان کی صفت تو یہ ہے:

اَلَّذِيۡنَ يُكَذِّبُوۡنَ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِo

جو جھوٹ جانتے ہیں انصاف کے دن کو

یعنی وہ لوگ جزا کے دن کا انکار کرتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ ان کا انکار حقوق کی باز پرس اور واپسی کی حد تک ہی نہیں، بلکہ وہ سارے کارخانۂ جزا و سزا کے ہی منکر ہیں، اور آخرت کا یہ انکار بہت ساری برائیوں کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کے نتیجے میں بہت سی برائیاں جنم لیتی ہیں، چونکہ آخرت کے اعتقاد کا ایمان کے تمام امور میں دخل ہے چاہے وہ عبادات ہوں یا معاملات۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا كُلُّ مُعۡتَدٍ اَثِيۡمٍo

اور اُس کو جھٹلاتا ہے وہی جو بڑھ نکلنے والا گنہگار ہے

یعنی اس دن کی تکذیب وہی کرتا ہے جو کفر وفسق میں حد سے گزر گیا، کفر میں حد سے گزر جانا اس لحاظ سے ہے کہ جو شخص روزِ جزا کا منکر ہے وہ گویا اس بات کا منکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت دائمی ہے اور یہ کہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں رہے گا، وہ یہ سمجھتا ہے کہ مرنے کے ساتھ ہی میں اللہ تعالیٰ کی بندگی سے نکل جاؤں گا اور اللہ میرے مالک ہونے کے منصب سے معزول ہو جائے گا

جیسا دنیا کا مالک مملوک کے فوت ہونے سے اس کا مالک نہیں رہتا، وہ اس بات کا بھی منکر ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کی طاقت وقدرت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، اس کے ساتھ اللہ عز وجل کے عادل ہونے کا بھی منکر ہے، کیونکہ جب دنیا میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ظالم سے مظلوم کا بدلہ نہیں لیا، اب آخرت میں بھی اگر مظلوم کو حق نہ دلائے تو مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ظلم پر راضی ہے اور عادل نہیں ہے العیاذ باللہ، انہی فاسد عقائد کی وجہ سے وہ چند در چند کفر کا مرتکب ہو کر حد سے گزر گیا۔

اور فسق میں حد سے تجاوز اس وجہ سے ہے کہ جب روزِ جزا کا خوف دل سے اٹھ گیا تو وہ گناہوں پر دلیر ہو گیا اور یہ سمجھ لیا کہ موہوم جزا کے خوف سے نقد لذتوں کو چھوڑنا بڑی نادانی اور بے وقوفی کی بات ہے، تب وہ نفسِ امارہ کی خواہش کے مطابق فسق وفجور میں پھنس کر ساری حدود پھلانگ گیا، چنانچہ ''اثیم'' جو ''آثم'' سے مبالغے کا صیغہ ہے اسی معنی کی گواہی دیتا ہے۔

معتد اثیم کی تفسیر میں دوسرا قول:

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ معتد سے مراد ظالم، غاصب اور حقوق العباد تلف کرنے والا گنہگار ہے، اور ''اثیم'' سے وہ فاسق وگنہگار مراد ہے جو حقوق اللہ تلف کرے، جیسے زنا، لواطت، شراب نوشی، اور نماز روزہ چھوڑنے والا، پہلا گناہ متعدی ہے، دوسرا محض اس کی جان کا وبال ہے۔

غرض مقصود یہ ہے کہ روزِ جزا کا منکر وہی شخص ہوسکتا ہے جو کسی مذہب ومشرب، اور دین وملت کا قائل نہ ہو اور اس موقف کے حق میں جو عقلی دلائل قائم کیے گئے ہیں ان سے محض الحاد وبے دینی کی وجہ سے آنکھیں چرائے، بلکہ قرآن کی آیات اور انبیاء کی خبریں جن کی تائید معجزات قطعیہ سے کی گئی ہے وہ بھی اس کے ذہن میں کوئی فکر وعبرت پیدا نہیں کرتیں، چنانچہ فرمایا:

اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ٥

جب سنائے اُس کو ہماری آیتیں کہے نقلیں ہیں پہلوں کی

یعنی جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں جن میں روزِ جزا کا اثبات اور مخلوق کے حقوق کے متعلق باز پرس کا ذکر ہوتا ہے، تو وہ محض ضد وعناد کی وجہ سے کہتا ہے یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو بُرے کاموں سے ڈرانے کے لیے گھڑ لی گئی ہیں، تاکہ ملک میں ظلم، غضب اور فتنہ وفساد کی روک تھام ہو سکے، ورنہ ان باتوں کی حقیقت کچھ نہیں جس پر یقین کیا جائے۔

مصحف عثمانی کے تاریخی نسخے

ابومحفوظ الکریم معصومی رحمۃ اللہ علیہ

[مشہور محقق مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کا یہ تحقیقی مقالہ مجلۂ علوم اسلامیہ علی گڈھ میں دسمبر ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا، مقالہ نہایت گراں قدر اور معلومات افزا ہے، اور افادیت کے پیش نظر المآثر میں شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)]

یہ خیال بہت عام ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلی بار قرآن کریم کو دودفتیوں میں جمع کیا، لیکن اس کے خلاف شواہد کی کمی نہیں ہے، قرآن کے نسخوں[1] پر ''مصحف'' کا اطلاق عہد عثمانی سے پہلے بھی ہوتا تھا اور اس کی ترتیب کتابی شکل ہی میں ہوتی تھی۔ حضرت علیؓ سے منقول ایک مستند روایت کے الفاظ ہیں: ''**سمعت علياً، يقول: أعظم الناس أجراً في المصاحف أبوبكر، رحمه الله على أبي بكر هو أول من جمع بين اللوحين**[2]''، اسی بنا پر یہ شکل مصحف، قرآن کا جمع کیا جانا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولیات میں شمار ہوتا ہے[3]۔ بلکہ نیشاپوری نے مقدمۂ تفسیر میں صراحت کی ہے کہ حضرت ابوبکر نے صحابہ کرام کے مشورے سے نسخۂ قرآن کا نام ''مصحف'' رکھا تھا[4]۔ حضرت

(۱) مصحف کا اطلاق بعض قدیم مصنفین قراءتوں پر بھی کرتے تھے جیسے ابوبکر بن ابی داؤد اور خود ابوداؤد، رک (= رجوع کنید) کتاب المصاحف ص ۵۰ ومابعد۔

(۲) کتاب المصاحف ص ۵ De Goeje Fund رقم ix حافظ ابن حجر نے اس اثر کو نقل کرتے ہوئے اس کی سند کو ''حسن'' قرار دیا ہے، لیکن متن میں انھوں نے دو مختلف سلسلوں کے طبع الفاظ ملا دیئے ہیں اور ''**بين اللوحين**'' کے الفاظ حذف کردیئے ہیں، رک فتح الباری (۹:۹) طبع مصر، ۱۳۲۵ھ، بعد کے لوگوں نے فتح الباری ہی کے الفاظ نقل کیے ہیں، سیوطی: الإتقان (۱:۹۹) مصر ۱۹۴۱، روح المعانی (۱:۲۲) طبع المنبر یہ،

(۳) سیوطی: **تاریخ الخلفاء** ص ۵۷ طبع ہند۔

(۴) نیشاپوری: **على هامش الطبری** (۱:۴۴) نیشاپوری کے سامنے کس درجہ کی روایت تھی، ہمیں معلوم نہیں، ہمارے سامنے حضرت علی کا اثر بہت کافی ہے، اس کے علاوہ ابوالعالیہ (م ۹۰ھ) کے یہ الفاظ ہیں: ''**انهم جمعوا القرآن في مصحف في خلافة ابي بكر**'' رک ابن ابی داؤد کتاب المصاحف ص ۹۔ سیوطی نے ایک عجیب وغریب روایت ابن اشتہ کی ''کتاب المصاحف'' سے نقل کی ہے کہ حضرت سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہما نے اپنے مرتبہ نسخہ قرآن کا نام ''مصحف'' رکھا تھا، اس کی غرابت سیوطی سے مخفی نہیں، تاہم انھوں نے اس کی توجیہ یوں کی ہے کہ سالم کا یہ کارنامہ ابوبکر صدیق کے حکم سے ہوا ہوگا حالانکہ سالم کی شہادت جنگ ''یمامہ'' میں ہوچکی تھی، آلوسی نے ٹھیک ہی لکھا ہے: ''**وهي عثرة منه لا يقال لصاحبها لعا**'' روح المعانی ۱:۲۲، الإتقان (۱:۱۰۰)

عمر کا یہ قول بہت مشہور ہے ''**لا یملین فی مصاحفنا إلا غلمان قریش وثقیف**[۱]''۔ عہد عثمانی سے پہلے معروف کاتبین وحی کے علاوہ کچھ لوگ کتابتِ مصاحف کے لیے مشہور تھے؛ جیسے نافع بن ظریب النوفلي[۲] جن کے متعلق ابوالمنذر ہشام بن محمد الکلبی کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے مصاحف کی کتابت کرتے تھے، یا ناجیۃ الطفاوی[۳] جن کا تذکرہ اسی لحاظ سے کیا جاتا ہے کہ نقل مصاحف کا مشغلہ رکھتے تھے۔

سفر و حضر میں بڑی تقطیع کے قرآنی نسخوں کی حفاظت اسی طور پر ہو سکتی تھی کہ صحفِ صدیقی یا صحابہ کے نسخوں کی نقل حاصل کرنے والے پوری نقل کو دو دفتیوں میں محفوظ رکھیں۔

عہد فاروقی میں حضرت ابوالدرداء کی رفاقت میں کئی دمشقی مدینہ پہنچے تھے[۴] کہ اپنے مصحف کی تصحیح مدینہ کے قرّا صحابہ اور اصل نسخوں سے مقابلہ کے ذریعہ کریں۔ یہ بھی واضح رہے کہ مصحف کا لفظ اسلام سے پہلے عرب شعرا کی زبان پر مسیحی صحیفوں کے لیے رائج تھا، امرءالقیس الکندی کا شعر ہے[۵]:

أتت حججٌ بعدی علیها فأصبحت کخطِّ زبورٍ فی مصاحفِ رهبانِ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اصل کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے ''صحف صدیقی'' کی اشاعت عام کر دی اور تمام مصاحفِ فردیہ کو یک قلم موقوف کر دیا، جن کی اشاعت کے باعث ''**أحرف سبعه**[۶]'' کی یکساں قرآنیت کا عقیدہ کمزور ہو رہا تھا؛ یہ اقدام حضرت عثمانؓ کے تنہا غور و فکر کا نتیجہ نہیں تھا[۷] بلکہ مدینہ کے صحابۂ کرام جن کی تعداد بارہ ہزار کے قریب تھی[۸] ان سب کا متفقہ فیصلہ یہی ہوا اور اسے بیرونی دیار و امصار کے صحابہ کی پوری تائید حاصل رہی۔

---

(۱) کتاب المصاحف ص ۱۱، فتح الباری (۹:۹) (۲) ابن حجر: الإصابہ (۳:۵۱۵) مصر ۱۹۳۹ع
(۳) ایضاً (۳:۵۱۳) (۴) کتاب المصاحف ص ۱۵۵
(۵) دیوان امرئ القیس (شرح الوزیر) ص ۹۶؛ العقد الثمین ص ۱۶۰
(۶) اس بحث کی تفصیلات فتح الباری (۹:۱۸) الإتقان، روح المعانی (۱:۲۱) وغیرہ میں، رک عام ہیں؛ خاص طور پر موسی جاراللہ مرحوم اور عبدالعظیم زرقانی کی تنقیحات قابل مطالعہ ہیں، موسی جاراللہ کتاب **ترتیب السور الکریمة وتناسبها فی النزول وفی المصاحف** ص ۲۶۰-۲۶۳؛ زرقانی: مناہل العرفان فی علوم القرآن (۱:۱۳۰-۱۸۵) مصر ۱۳۷۲ھ
(۷) اس سلسلے میں جاحظ کی تحریر بھی قابل مطالعہ ہے، دیکھئے رسائل الجاحظ ص ۱۲۰-۱۲۳ مصر ۱۹۳۳
(۸) الجعبری (۶۴۰-۷۳۲ھ): جمیلة ارباب المراصد، ورق ۱۲ ب مخطوطۃ ایشاٹک سوسائٹی آف بنگال رقم A 126۔ طاہر الکروی: تاریخ القرآن وغرائب رسمہ ص ۶۰

مجلس صحابہ کی کارروائی کا واضح عکس علی کرمؔ اللہ وجہہ کی تقریر [۱] میں نظر آتا ہے، جس کی روایت مشہور تابعی سوید بن غفلہ الجعفی [۲] کی زبانی محفوظ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، جن کی مخالفت کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے، ابن الواضح یعقوبی نے ان کے متعلق ایسی روایت بھی لکھی ہے جس کی معنوی قوت ناقابل انکار ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ایک مصحف پر لوگوں کو جمع کرنے کی تجویز خود حضرت ابن مسعود [۳] نے لکھ بھیجی تھی، بعد میں جب ان کو معلوم ہوا کہ انفرادی مصاحف جلا ڈالے جائیں گے، تو ان کی رائے بدل گئی، اصل یہ ہے کہ ان کی مخالفت کی وہ نوعیت ہرگز نہ رہی ہوگی جو ظاہری روایتوں سے اخذ کر لی جاتی ہے۔ چنانچہ ان کی مخالفانہ تقریروں میں کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ مصاحف عثمانیہ کی صحت واستناد پر ان کو کسی نہج سے اعتراض تھا، معوذتین وفاتحہ جن کی قرآنیت سے خود ان کو انکار نہیں تھا اور بعض دوسرے جزئیات جن میں ان کی رائے الگ تھی، ان تمام مسائل میں ان کی کیفیت یہی رہی کہ تحقیق حق کے بعد ان کی مخالفت [۴] ختم ہو گئیں، ابن ابی داوٗد نے جمع عثمانی پر ابن مسعود [۵] کی رضامندی کا مستقل باب باندھ کر فلفلۃ الجعفی [۶] کی زبانی یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ اشاعت مصاحف عثمانی کی اطلاع جب اہل کوفہ کو پہنچی تو کچھ لوگ حضرت ابن مسعود کے پاس پہنچے، ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم آپ کی خدمت میں یونہی ملاقات کی غرض سے حاضر نہیں ہوئے ہیں، بلکہ اس تازہ خبر (اشاعت مصاحف کی خبر) سے پریشان ہو کر آئے ہیں کہ آپ

---

(۱) پوری تقریر کتاب المصاحف میں درج ہے ص۲۲-۲۳۔ اقتباسات کے لیے دیکھئے: فتح الباری ۹: ۱۵)، روح المعانی (۱: ۲۳؛ ابوعبداللہ زنجانی: تاریخ القرآن ۴۶ نیز المنتقی من منہاج الاِعتدال للذہبی ص۳۹۳ حاشیہ محبّ الدین رقم ۲ وغیر۔

(۲) متوفی ۸۰ھ الاِصابۃ (۲: ۱۱۷) رقم: ۳۷۲۰

(۳) تاریخ الیعقوبی (۲: ۲۴۷) طبع نجف ۱۳۵۸ھ

(۴) دیکھئے فتح الباری (۸: ۵۷۱) مصر ۱۳۰۱ھ اور خاص طور پر: مناہل العرفان (۱: ۲۶۸-۲۶۹)

(۵) کتاب المصاحف ص ۱۸، حافظ ابن حجر نے اس باب کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ اس کے تحت جو روایت فلفلۃ الجعفی کی درج ہے وہ ترجمۃ الباب سے مطابقت نہیں رکھتی ہے۔ رک فتح الباری (۹: ۴۱) عدم مطابقت کا شکوہ ہمارے خیال ناقص میں یوں پیدا ہوا کہ ابن حجر کی نظر صرف اسی مسلک پر مرکوز رہی کہ جمع عثمانی کا مقصد ''حرف واحد'' کو بالاتفاق اختیار کرنا تھا، جیسا کہ امام طبری اور ان کے ہم خیال محققین کی رائے ہے۔ دیکھئے مقدمۂ تفسیر طبری (۱: ۱۹، ۲۱) فتح الباری (۹: ۲۴) اگر اشتمال علی الأحرف السبعۃ کا قول ملحوظ رکھا جائے، جیسا کہ باقلانی اور ان کی رائے سے اتفاق رکھنے والوں کا کہنا ہے تو ترجمۃ الباب سے روایت کی ہم آہنگی خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔

(۶) فلفلۃ بن عبداللہ الجعفی الکوفی کے لیے دیکھئے: تہذیب التہذیب (۸: ۳۰۲)

ہمیں مطمئن کردیں۔ ابن مسعود نے ان لوگوں کے جواب میں یہ فرمایا ''إن القرآن أنزل علی نبیکم من سبعة أبواب، علی سبعة أحرف [أو حرف] وإن الکتاب قبلکم کان ینزل [أو نزل] من باب واحد معناهما واحد[1]'' اس جواب سے ظاہر ہے کہ حضرت ابن مسعود کے نزدیک مصاحف عثمانی کی اشاعت پر لوگوں کو جو تشویش لاحق ہوئی تھی۔ وہ بالکل بجا اور ''سبعة أحرف'' کی مبینہ قرآنیت سے ناواقفیت پر مبنی تھی۔ امام باقلانی اور ان کے ہم خیال محققین کے اس مسلک کے بموجب، کہ مصحف عثمانی ''سبعة أحرف'' کو محیط[2] ہے، حضرت ابن مسعود کا یہ جواب مصحف عثمانی پر ان کے اعتماد واطمینان کا بین ثبوت ہے۔ ابن کثیر نے یہ صراحت کی ہے کہ حضرت عثمان نے ابن مسعود سے خط وکتابت کرکے ان کو بھی متفق کرہی لیا تھا: ''فأناب وأجاب إلی المتابعة وترک المخالفة[3]''۔ ان باتوں سے غالب گمان ہوتا ہے کہ حضرت ابن مسعود نے اپنا مرتبہ نسخہ قرآن[4] بعد میں اپنی رضامندی سے حضرت عثمانؓ کے سپرد فرمایا ہوگا، اگرچہ ابن العربی کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس سلسلے میں حضرت عثمان کو اپنا اختیار خصوصی استعمال کرنا پڑا تھا، اصل الفاظ یہ ہیں ''فأکرهه عثمان علی رفع مصحفه و محارسومه فلم یثبت له قراء ة أبداً[5]''۔

حضرت عثمانؓ نے جس طرح اشاعت مصحف صدیقی کا فیصلہ صحابہ کے مشورے سے کیا تھا، نقل نویسوں اور املا کرنے والوں کا انتخاب بھی انھی کی رائے سے کیا، خصوصاً کاتبین مصحف کی سرکردگی قراءت وکتابت میں زید بن ثابت کو اور املا میں سعید بن العاص (بن سعید بن العاص) کو اسی مجمع میں تحقیق حال کے بعد بلا اختلاف[6] رائے دی گئی۔ ضرورت کے مطابق کاتبین کے زمرے میں اور اشخاص بھی شامل کیے گئے، امام بخاری کی روایت[7] میں ان میں سے عبداللہ بن الزبیر اور عبدالرحمٰن

(۱) اس روایت کے دوسرے الفاظ وطریق کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری (۹:۲۴)

(۲) دیکھئے: فتح الباری (۹:۲۴)، ابن الجوزی: طیبة النشر (۱: ۳۱)؛ الإتقان (۱: ۸۵)؛ عبدالعظیم زرقانی؛ مناہل العرفان (۱: ۱۴۶-۱۶۴) اور (۱: ۳۹۳-۴۹۴)؛ موسی جاراللہ: ترتیب السور الکریمة ص ۲۶۰-۲۷۳۔

(۳) البدایة النهایة (۷:۲۱۷)

(۴) حضرت ابن مسعود کے مرتبہ مصحف کا معتبر نسخہ ہرگز موجود نہیں رہا۔ چوتھی صدی کے مشہور وراق، ابن الندیم کا بیان ہے کہ مصحف ابن مسعود کی کئی نقلیں نظر آئیں، لیکن ان میں سے کوئی دو نسخے بھی یکساں نہیں ملے، اسی وراق کا بیان ہے کہ ایک نسخہ جو تقریبا دوسو سال کا ہوگا اس میں سورہ فاتحہ بھی نوشتہ تھا، رک الفہرست ص ۴۰ طبع مصر ۱۳۴۸ھ

(۵) العواصم والقواصم (۲:۱۰۸) طبع الجزائر۔

(۶) حضرت علی کی تقریر بروایت سوید بن غفلہ کتاب المصاحف ص ۲۲۔

(۷) بخاری: الجامع الصحیح (۶:۲۲۶) طبع مصر ۱۳۴۵ھ۔

ابن الحارث بن ہشام المخز ومی (م۴۳ھ) کے نام بھی ملتے ہیں۔ ویسے کاتبین کی مجموعی تعداد ۱۲ تک پہنچتی ہے [۱] اوران چار ناموں کے علاوہ حضرت اُبی بن کعب، عبداللہ بن عمرو بن العاص، عبداللہ بن عباس، انس بن مالک، مالک بن ابی عامر، اور افلح بن کثیر کے نام متفرق [۲] روایات کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔

اس فہرست کے دوناموں میں روایتی اختلاف بھی ہے۔ سعید بن العاص کی جگہ ان کے چچا ابان بن سعید بن العاص کا ذکر عمارۃ بن غزیۃ [۳] کی روایت میں آتا ہے۔ مشہور قول کے مطابق اس وقت تک ابان بن سعید کا زندہ رہنا صحیح نہیں ہے۔ موسیٰ بن عقبہ اور اکثر علمائے انساب نے معرکۂ اجنادین ۱۳ھ میں ابان کی شہادت بتائی ہے؛ صرف ایک مؤرخ ابوحسان الزیادی (م۲۴۳ھ) نے ابان کی وفات ۲۷ھ میں قراردی ہے [۴]۔

اسی نوعیت کا بڑا اختلاف عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام کے سلسلے میں پیدا ہوتا ہے۔ کاتبین مصحف کے زمرے میں عبدالرحمٰن بن الحارث کی شمولیت بخاری کی روایت سے ثابت ہوتی ہے۔ اسی روایت کی نقل حمیدی (م۴۸۸ھ) کی کتاب ''**الجمع بین الصحیحین**'' میں ملتی ہے۔ لیکن حمیدی کی نقل میں عبدالرحمٰن بن الحارث کی جگہ عبداللہ بن الحارث بن ہشام المخز ومی کا نام [۵] درج ملتا ہے۔ ''صحیح بخاری'' کے متداول نسخوں میں ایسا اختلاف نہیں پایا جاتا، اس کے باوجود اس تغیر کو ہم حمیدی کے تسامح پر محمول نہیں کرسکتے کہ اس موقع پر ابن الصلاح نے بہت محتاط ہوکر گفتگو کی ہے؛

(۱) کتاب المصاحف ص۲۵: فتح الباری (۹: ۱۵) وغیرہ۔

(۲) کتاب المصاحف ص۱۹ تا ۲۶: تفسیر طبری (۱: ۲۱) الدانی کتاب المقنع ص ۵، ۷: جمیلۃ ارباب المراصد ورق ۱۳ظ: حافظ ابن حجر نے عبداللہ بن عمر کا ذکر نہیں کیا ہے، فتح الباری (۹: ۱۵)۔

(۳) م۱۴۰ھ تفسیر طبری میں غزیۃ کی جگہ ''خزیمۃ'' ہمارے خیال میں تصحیف مطبعی ہے؛ اگرچہ ایک راوی عمارہ بن خزیمۃ، (م ۱۰۵ھ) بھی ہوئے ہیں، عمارۃ بن غزیۃ کی محولہ بالا روایت کو حافظ ابن حجر نے شاذ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے: ''**تفرد بھا نعیم بن حماد عن الدراوردی**'' الإصابۃ (۱: ۲۰) طبع کلکتہ، مگر حقیقت یہ ہے کہ نعیم بن حماد، باوجودیکہ ''لین الحدیث'' ہے اس روایت میں متفرد نہیں، کہ یہی روایت دراوردی سے احمد بن عبدہ الضبی کی بھی ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر طبری (۱: ۱۹، ۲۰) لیکن فتح الباری میں حافظ ابن حجر نے دوسرے انداز میں نقد کیا ہے اور خطیب بغدادی کے حوالہ سے ابان بن سعید کے ذکر کو دراوردی کے شیخ عمارہ بن غزیہ کا وہم قرار دیا ہے۔ رک فتح الباری (۹: ۱۵) اس روایت پر مزید بحث کے لیے ملاحظہ کیجئے فتح الباری (۹: ۸)۔

(۴) الاستیعاب علی ہامش الاصابۃ (۱: ۴۶-۴۸) مطبوع مصر؛ الإصابۃ (۱: ۲۰) مطبوع کلکتہ۔

(۵) للحمیدی: کتاب الجمع بین الصحیحین الجزء الاول، ورق ۲ظ، نسخہ مجمع اسیاوی کلکتہ رقم A. 185

حالانکہ ''الجمع بين الصحيحين ''للحمیدی پر ابن الصلاح کی جو تعلیقات ثبت ملتی ہیں، ان میں حمیدی کی مسامحات کی نشاندہی خاص طور پر کی گئی ہے۔ ابن الصلاح کے اصل الفاظ یہ ہیں:

''عبدالرحمن بن الحارث بن هشام؛ إذ هو كذالک فيما عندنا من كتاب البخاری وهو المعروف وعبدالله بن الحارث بن هشام له وجود فی ذلک العصر [1] أيضاً؛ ذكره ابن عبدالبر [2] وابن أبی حاتم، وإن فات الخطيب أبا بكر، فلم يذكره فيمن اسمه عبدالله بن الحارث، والله اعلم''۔

حمیدی کے علاوہ، متأخرین میں سے الجعبری (م ۷۳۲ھ) شارح ''عقیلہ'' شاطبیہ نے جہاں کاتبین مصحف عثمانی کی نشاندہی مختلف روایات کی رو سے کی ہے، عبداللہ بن الحارث بن ہشام المخزومی کا نام بھی درج کیا ہے [3]۔ عبداللہ کی شمولیت کے بعد کاتبین مصحف کی فہرست میں صرف ایک نام کی جگہ خالی رہتی ہے۔

اشاعت مصاحف کی کاروائی از روئے تحقیق ۲۵ھ [4] کے اواخر سے شروع ہوئی تھی اور ۳۰ھ تک جاری رہی۔ تمام نسخے اس وقت کے مروجہ خط ''الجزم'' میں لکھے گئے، جسے بعد میں خط کوفی کا نام دیا گیا۔ اس وقت تک خط جزم نقط وشکل سے خالی ہوا کرتا تھا، اس لیے مصاحف عثمانیہ بھی اعراب

---

(۱) یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ انساب قریش کے دو معروف محقق مصعب الزبیری (م ۲۳۶ ہجری) اور زبیر بن بکار (م ۲۵۶ ہجری) نیز ابن قتیبہ دینوری (م ۲۷۶ ہجری) نے حارث بن ہشام مخزومی کی اولاد کے تذکرے میں عبداللہ بن الحارث کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔ نسب قریش: ص ۳۰۳ دار المعارف مصر ۱۹۵۳م، جمہرۃ نسب قریش واخبارہا للزبیر بن بکار الزبیری: ورق 130b تصویر نسخۂ بودلیانا، آکسفورڈ۔ کتاب المعارف: ص ۱۴۳-۱۴۴ طبع وستنفلد، غوتجن ۱۸۵۰م

(۲) ابن عبدالبر القرطبی: الاِستیعاب: ۳۴۴ رقم ۱۴۸۱، حیدر آباد ۱۳۳۶ھ، ابن ابی حاتم: کتاب الجرح والتعدیل جلد ۲ قسم ۲ ص ۳۲ رقم ۱۴۲، حیدر آباد ۱۹۵۳م، ابن الأثیر: اسد الغابہ: (۳: ۱۴۰)، ابن حجر (۲: ۵۹) رقم ۶۱۷۲ مصر ۱۹۳۹م

(۳) جمیلۃ ارباب المراصد، ورق ۱۳ ظ نسخۂ جمع اسیاوی کلکتہ۔

(۴) فتح الباری (۹: ۱۴)؛ کتاب ترتیب السور الکریمہ ص ۲۷۱-۲۷۲، تاریخ القرآن وغرائب رسمہ: ص ۵۱-۵۲۔ معرکۂ آذربیجان وارمینیہ کے سلسلے میں دیکھیے: فتوح البلدان ص ۳۲۸ طبع لیدن۔ طبری نے دونوں جنگوں کی تاریخ بہ روایت ابو مخنف ۲۴ ہجری بتائی ہے، دوسرے قدیم مؤرخین ۲۶ ہجری بتاتے ہیں، رک تاریخ الامم والملوک (۳: ۳۰۷) مصر ۱۹۳۹، ابن الاثیر۔ ابوالفداء، ابن خلدون وغیرہ جمع قرآن کا تذکرہ ۳۰ھ کے تحت کرتے ہیں، حافظ ابن حجر نے اس سے اختلاف کیا ہے، ابن کثیر نے اشاعت مصاحف کے تذکرے میں تاریخ کی صراحت نہیں کی ہے۔ علامہ موسی جار اللہ نے اس کی تاریخ ۲۵ ہجری کے اواخر سے ۳۰ھ تک لکھی ہے۔ ہمارے خیال میں جمع بین الاقوال کی مناسب شکل یہی ہے۔

اور نقطوں سے یکسر [۱] معریٰ تھے اور ان کی قراءت عربوں کے روایتی سلیقہ پر چھوڑی نہیں جاسکتی تھی۔ قراءت میں ادائیگی کی وہی کیفیتیں صحیح تھیں جن کا ثبوت نبی اکرم ﷺ سے بالمشافہ سماع کے ذریعہ صحابہ کو مسلم تھا۔ لہذا ہر نسخے کے ساتھ ایک مستند قاری بھیجے گئے، مدینہ کے عوام کو صحیح قراءت سکھانے پر زید بن ثابت مامور ہوئے، اسی طرح عبداللہ بن السائب (م ۷۰ھ ہجری تقریباً)، عامر بن عبد مقیس، ابوعبدالرحمٰن السلمی [۲] اور مغیرہ بن ابی شہاب (م ۹۱ھ ہجری) علی الترتیب، مکی، بصری، کوفی اور شامی نسخوں کے ساتھ روانہ کیے گئے کہ عوام کو قراءت صحیح ثابتہ کی تعلیم دیں۔

مصاحف عثمانی کی تعداد میں اقوال بہت مختلف ہیں، غالباً صحیح یہ ہے کہ کل آٹھ نسخے تھے، جن میں سے ایک حضرت عثمان کے پاس رہا۔ قرّا کی ایک جماعت [۳] اسی کو ''الامام'' کہتی ہے، کچھ لوگ ''امام'' کا اطلاق ''مصاحف امصار'' پر [۴] بھی کرتے ہیں؛ اور ہمارے خیال میں ان تمام نسخوں میں سے ہر ایک کی اپنی جگہ جو حیثیت مسلم تھی اس کے اعتبار سے تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بہر حال باقی سات نسخے مدینہ، مکہ، بصرہ، کوفہ، شام، یمن اور بحرین کو بھیجے گئے۔ ابن کثیر نے بحرین کی جگہ مصر کا ذکر کیا ہے [۵] اور مصحف خاص کو شمار نہیں کیا۔ مؤرخ یعقوبی کا بیان سب سے الگ ہے، اس نے مذکورہ بالا مقامات کے ساتھ مصر اور الجزیرہ کو شامل کر کے ''مصاحف امصار'' کی تعداد ۹ تک پہنچا دی ہے [۶]۔ یمن اور بحرین کے نسخوں کے علاوہ مصحف خاص اور مصاحف خمسہ عامہ کے بارے میں شک وشبہہ کی کوئی گنجائش رہتی، اس لیے کہ ان چھ نسخوں کے رسم الخط کے متعلق تمام تفصیلات قرا کی روایتوں

(۱) کتاب المصاحف، باب نقط المصاحف وغیرہ بالدانی: کتاب المحکم فی لفظ المصاحف ص ۱۰

(۲) کتاب المصاحف ص ۳۴، الدانی: المقنع ص ۱۰: العواصم والقواصم (۲: ۱۹۳، ۲۰۴) ابن الجزری: طیبۃ النشر (۱: ۷)، فتح الباری (۱۶:۹)؛ الکردی: ۷۹؛ الزرقانی: مناہل العرفان (۱: ۳۹۵-۳۹۶)۔

(۳) مثلاً ابوعبید القاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ) ابوبکر بن ابی داؤد (م ۳۱۶ھ) دیکھیے کتاب المصاحف ص ۳۷؛ المقنع ص ۱۵ وغیرہ۔

(۴) جیسے عاصم الجحدری، کثیر بن عبید، ابوالبرہسم وغیرہ۔ دیکھئے کتاب المصاحف ص ۴۴؛ المقنع ص ۱۶؛ ابن کثیر کے الفاظ ہیں ''ویقال لهذه المصاحف الائمة'' رک البدایۃ والنہایۃ (۷: ۲۱۶)، امام مالک کے ایک مقولہ میں ''الامام کا لفظ اصل نسخۂ عثمانی کی نقل پر اطلاق کیا گیا ہے، اصل الفاظ یہ ہیں: ولا یزال الانسان یسألنی عن نقط القرآن، فأقول له: أما الإمام من المصاحف فلا أری أن ینقط'' رک کتاب المحکم فی نقط المصاحف: ص ۱۱ تحقیق الدکتور عزۃ حسن ۱۹۶۰ م۔

(۵) البدایۃ والنہایۃ (۷: ۲۱۶)

(۶) تاریخ الیعقوبی (۲: ۱۴۷) طبع نجف

میں متداول ومعروف ہیں [۱]۔ البتہ یمن اور بحرین کے نسخوں کی بابت محققین قراءت کا یہ اعتراف ملتا ہے کہ ان کی روایتوں میں ان دو مصحفوں کا کوئی حوالہ نہیں آتا [۲]۔

تاریخی روایات میں متعدد مصاحف کا تذکرہ ملتا ہے، جن کی شہرت سے حضرت عثمان کے شائع کردہ مصاحف کے اصلی نسخوں کی حیثیت سے تھی۔ ان نسخوں کے متعلق منتشر اطلاعات کا خلاصہ ذیل کی سطروں میں پیش کیا جاتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ کسی قدیم مصحف کو اصل نسخۂ عثمانی کی حیثیت سے مشہور کردینا جس قدر آسان ہے، اس کی اصلیت کا ثابت کرنا اسی قدر دشوار ہے؛ کوئی قدیم نسخہ جس کے خط کی قدامت مسلم ہو، جس میں نقطے اور اعراب نہ لگے ہوں، جس کی لکھائی کھال یا قرطاس [۳] پر ہو، جس کی تقطیع عہد صحابہ وتابعین کی روایتی تقطیع کے مطابق اور جس کی رسم، رسم عثمانی ہو، غرض اس میں تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہوں، پھر بھی اسے اصل نسخۂ عثمانی قرار دینے کے لیے کوئی یقینی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اسی دشواری کی وجہ سے علامۂ سمہودی نے ''مصحف مدینہ'' کے سلسلہ میں بحث وتمحیص کے بعد یہ لکھا ہے: ''**ليس معنا في أمر المصحف الموجود اليوم سوى مجرد احتمال**'' [۴]۔ جن نسخوں کا تذکرہ ذیل میں درج کیا جارہا ہے ہمیں اعتراف کرلینا چاہئے کہ ان کے متعلق جملہ تاریخی معلومات کا استقصا کرنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا؛ اور معلوم نہیں کہ ان نسخوں کے علاوہ اور کتنے نسخے ہوں گے جن کی بابت ہمارے پاس کوئی اطلاع نہیں۔

---

(۱) کتاب المصاحف، کتاب المقنع اور دوسری تمام فنی کتابیں۔

(۲) فتح الباری (۲۶:۹) جمیلہ شرح العقیلہ، ورق ۱۴ب: ''**فلم نسمع لهما خبراً ولا علمنا من نفذ معهما**''۔ جعبری نے یہ الفاظ ابوعلی (الاہوازی؟) کے حوالہ سے نقل کیے ہیں۔

(۳) قرطاس کا استعمال دور جاہلیت میں ہوا کرتا تھا، اس کا ثبوت خود قرآن مجید میں ملتا ہے، سورۃ الانعام رکوع ۱، آیۃ ۶؛ نیز رکوع ۱۱، آیۃ ۱، غالباً شام سے اس کی درآمد ہوتی تھی، طرفۃ بن العبد کا شعر ہے:

وخد كقرطاس الشآمي ومشفر — كسبت اليماني قده لم يجرد

عہد عثمانی کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ مصاحف کی کتابت کھال پر ہوتی تھی، لیکن تعدد نسخ کے پیش نظر ممکن ہے کہ قرطاس بھی استعمال کیا گیا ہو۔ خاص طور پر صحف صدیقی کے بارے میں سالم اور خارجہ بن زید کا بیان ہے: ''**إن أبا بكر كان جمع القرآن في قراطيس**'' رک کتاب المصاحف ص ۹۔ یہی الفاظ ابن حجر نے براہ راست ''مؤطا ابن وہب'' کے حوالہ سے نقل کیے ہیں۔ رک فتح الباری (۱۳:۹)

(۴) وفاء الوفا (۱: ۴۸۲)

مصحف خاص:

مصحف کا خاص نسخہ جو حضرت عثمانؓ کے سامنے بوقت شہادت موجود تھا، اس کا سراغ تقریباً مسلسل ومربوط اطلاعات کے ذریعہ چوتھی صدی ہجری کے وسط تک ملتا ہے۔ ہمارے علم میں اس نسخے کے متعلق قدیم ترین اطلاع عمرۃ بنت قیس العدویہ [۱] کی ہے، جو احمد بن محمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ (م ھ) کی سند سے ''کتاب الزہد'' میں درج ہے [۲]۔ عمرۃ العدویہ واقعۂ شہادت کے بعد ہی مدینہ پہنچی تھیں اور ان کو مصحف خاص کے دیکھنے کا موقع ملا تھا، روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''**فـــرأيـــنـــا مـصـحف الـذی قتـل وهـو فـی حجره، فكانت أول قطرة قطرت من دمه علی هذه الآية: فسيـكـفيهـم الـلّـه وهـو الـسـميـع الـعـليم؛ قالت عمرة، فما مات منهم رجل سوياً**''۔

خود آل عثمان کا بیان، بظاہر روایت مذکورہ کے خلاف، حجاج بن یوسف کے ایک ملازم ثابت مولیٰ سلمۃ بن عبدالملک کی زبانی منقول ہے کہ جس وقت حجاج کی طرف سے منقوط مصاحف کی اشاعت کی گئی ایک نسخہ مدینہ کے لیے بھی ارسال کیا گیا؛ حجاج کا مصحف دیکھ کر آل عثمان کچھ بیزار ہوئے، اور ان سے کہا گیا کہ حضرت عثمانؓ کا مصحف نکال کر دیں تو اسی کی قراءت کی جائے، مگر آل عثمان نے یہ جواب دیا کہ وہ نسخہ تو شہادت کے دن ہی تلف ہو گیا [۳]۔

اس روایت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ خود اہل مدینہ اس کے تلف ہو جانے کے قائل نہیں تھے، دوسرے واقعات وشواہد سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ طبقۂ تبع تابعین میں سے خالد بن ایاس العدوی المدنی [۴] جو مسجد نبوی کے مشہور پیش امام تھے، انھوں نے مصحف خاص کی قراءت ایسی دقت نظر کے ساتھ کی تھی کہ آج تک مصحف خاص کی خصوصیتیں ان کے حوالے سے فن قرأت کی کتابوں (۵) میں محفوظ ہیں؛ اس کے سوا ثابت مولی سلمہ کے بیان کا ناقل محرز بن ثابت آل عثمان کے

(۱) دیکھئے تہذیب التہذیب (۱۲: ۴۴۰) رقم ۲۸۵۴؛ تقریب التہذیب ص ۶۶۲ طبع نولکشور لکھنؤ، ۱۹۳۷۔

(۲) کتاب الزہد ص ۱۲۷-۱۲۸، ام القریٰ ۱۳۵۷ھ۔

(۳) سمہودی: وفاء الوفا (ص ۴۸۱)

(۴) خالد بن الیاس، او ایاس دیکھئے تہذیب التہذیب (۳: ۸۰) رقم: ۱۵۲؛ میزان الاعتدال (۱: ۲۹۵) رقم ۲۳۶۱ طبع مصر ۱۳۲۵ھ؛ ابن ابی داؤد: ''خالد بن ابی ایاس ویقال ابی ایاس'' کتاب المصاحف ص ۴۲۔

(۵) کتاب المصاحف ص ۳۷؛ جمیلۃ ارباب المراصد ورق ۱۴۔

جواب پر قناعت نہیں کرتا اور اپنی تحقیق کے بموجب یہ اطلاع دیتا ہے[۱] کہ مصحف عثمان، خالد بن عمرو ابن عثمان کے پاس محفوظ تھا[۲]۔

اس سلسلے میں امام مالک کا قول نقل کیا جاتا ہے جس کا خلاصہ بس اتنا ہے کہ ان کو اپنے شیوخ سے اس نسخے کی بابت کسی طرح کی اطلاع نہیں پہنچی۔ اصل الفاظ بہ روایت[۳] شاطبی (م ۵۹۰ھ) یہ ہیں: ''**إن مصحف عثمان رضی الله عنه تغیب فلم نجد له خبراً بین الأشیاخ**''۔ ان الفاظ کی حد تک یقیناً آل عثمان کے دعویٰ کی تصدیق نہیں ہوتی؛ لیکن ابن ابی داؤد نے بہ روایت ابن وہب جو قول نقل کیا ہے وہ مذکورہ بالا الفاظ سے بالکل مختلف نظر آتا ہے: ''**قال سألت مالکا عن مصحف عثمان رضی الله عنه فقال لی ذهب**''[۴] تاہم اس سے کوئی قطعی پہلو مصحف کے تلف ہو جانے کا نہیں نکلتا۔

بہر حال اس نسخے کا وجود جن مذکورہ بالا شواہد سے ثابت ہوتا ہے ان کی قوت میں شبہہ نہیں؛ پھر تیسری صدی کے اوائل کے ایک مستند اور مشہور محقق ابوعبید القاسم بن سلام (۱۵۰ھ-۲۲۳ھ) کا نسخۂ خاص عثمانی سے شرف اندوز ہونا اس مسئلہ کو طے کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ابوعبید نے ''کتاب القرأت'' میں بیان کیا ہے[۵] کہ حضرت عثمان کا مصحف ''امام'' میں نے خود دیکھا ہے، بعض امراء کے خزانے میں محفوظ تھا اور میری فرمائش پر نکالا گیا تھا؛ یہ وہی نسخہ تھا جو شہادت کے موقع پر حضرت عثمانؓ کے سامنے تھا، اس میں کئی جگہ خلیفۂ شہید کے خون کے دھبے موجود تھے اور سب سے زیادہ نشانات سورۂ ''والنجم'' میں تھے[۶]۔

(۱) وفاء الوفاء (۱:۴۸۱)۔ (۲) دیکھئے مصعب الزبیری: کتاب نسب قریش ص ۱۰۶؛ ابن قتیبہ؛ کتاب المعارف ص ۹۹۔

(۳) وفاء الوفاء (۱:۴۸۱)؛ یہ الفاظ شاطبی کی نظم ''عقیلۃ أتراب القصائد'' کے مندرج ذیل ابیات سے ماخوذ ہیں:

وقال مالک القرآن یکتب بالکتاب الأول، لا مستحدثاً سطراً

وقال مصحف عثمان تغیب لم نجد له بین أشیاخ الهدی، خبراً

(۴) کتاب المصاحف ص ۳۵

(۵) وفاء الوفاء (۱:۴۸۱)؛ اصل مأخذ شاطبی کا قصیدہ ہے جس میں منقولہ بالا شعروں کے بعد یہ اشعار ہیں:

أبو عبید الوا بعض الخزائن لی — استخرجوه مابصرت الدما أثرا

ورده ولدالنحاس معتمداً — ما قبله، وأباه منصف النظرا

إذ لم یقل مالک لاحت مهالکه — ما لا یفوت فیرجی طال أو قصرا

(۶) سورۃ النجم کا ذکر سمہودی نے نہیں کیا ہے: جعبری کی شرح العقیلہ میں اس کی تصریح ہے ''**ورأیت آثار الدم فی مواضع منه وأکثر ما رأیته فی سورة والنجم**'' مخطوطہ: ورق ۱۵ ظ

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ابو عبید نے کس امیر کے خزانے میں اس نسخۂ یگانہ کو دیکھا تھا۔ ان کے تعلقات خصوصی [1] جن امرائے دولت سے قائم تھے، ان میں سے طاہر بن الحسین (م ۲۰۷ھ) اور ثابت ابن نصر بن مالک الخزاعی (م ۲۰۸ھ) مشہور شخصیتیں تھیں؛ ثابت بن نصر ۱۷ سال تک ''ثغور الشام'' کا والی رہا۔ ابو عبید بھی کم وبیش ۱۸ سال طرسوس کے عہدۂ قضا پر مامور رہا؛ اور بہت جلد معلوم ہوگا کہ زیر بحث نسخہ تیسری صدی کے اواخر تک ''جند حمص'' کے ایک شہر میں کسی طرح پہنچ کر عوام وخواص کے لیے مرکز توجہ بن گیا تھا! لہذا ہمارا اندازہ ہے کہ یہ نسخہ کہیں شام کے علاقے میں ابو عبید کی نظر سے گذرا ہوگا۔

تیسری صدی کے اواخر میں ابن قتیبہ دینوری (م ۲۷۶ھ) کے ذریعہ اطلاع ملتی ہے کہ قرآن کریم کا وہ نسخہ جو حضرت عثمان کی گود میں تھا، خالد بن عثمان [2] کے پاس، پھر اس کی اولاد کے قبضے میں رہا، مگر ان لوگوں کی نسل منقطع ہوگئی اور مصحف کے بارے میں ابن قتیبہ کو مشائخ شام کی زبانی یہ اطلاع پہنچی کہ اب طرطوس میں موجود ہے [3]۔

ابو عبید اور ابن قتیبہ جیسے بلند پایہ محققوں کے بعد چوتھی صدی کے دو مشہور جغرافیہ نویس اصطخری اور ابن حوقل، انطرطوس (طرطوس) کے ذکر میں خصوصیت کے ساتھ اس ''اثری مصحف'' کی نشاندہی کرتے ہیں۔ گرچہ اس دور میں ابو جعفر النحاس (م ۳۳۸ھ) نے امام مالک کے قول سے استناد کرتے ہوئے مصحف خاص کے وجود سے انکار کردیا تھا، مگر ان تمام شواہد کے ہوتے ہوئے امام مالک کے غیر صریح قول سے استدلال کرنا کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتا، اور امام شاطبی نے اس بنا پر نحاس کے انکار کو غلط قرار دیا ہے۔

---

(۱) دیکھیے: تاریخ بغداد (۱۲: ۴۱۲) رقم ۶۸۶۸؛ زبیدی: طبقات النحویین واللغویین ص: ۲۱۷ (مصر ۱۹۵۴)؛ ابن خلکان: ۳/۲۲۵ رقم ۵۰۷، إنباہ الرواۃ: ۲/۱۳، رقم: ۵۵۰؛ معجم الأدباء (۱۶: ۲۰۵)؛ السبکی: طبقات الشافعیہ (۱: ۲۷۱)

(۲) دیکھیے نسب قریش ص ۱۱۹ محرز بن ثابت نے خالد بن عمر بن عثمان کا ذکر کیا ہے، اس اختلاف کا اثر نفس مسئلہ پر نہیں پڑتا، نیز ابن قتیبہ کی تائید بلاذری سے ہوتی ہے؛ لیکن بلاذری اور ابن قتیبہ کی یادداشتوں میں زبردست اختلاف یہ ہے کہ بلاذری کی صراحت کے مطابق خالد بن عثمان حضرت عثمان کی زندگی میں فوت ہوئے، مگر مصحف خاص کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ خالد بن عثمان کے لڑکوں کے قبضہ میں تھا۔ اصل الفاظ یہ ہیں **وأما خالد بن عثمان بن عفان، فتوفى فى خلافة أبيه، ركض دابة فاصابه قطع، فهلك منه، وله عقب وهو الذى يقال له الكسير، وكان مصحف عثمان الذى قتل وهو فى حجره عند ولده. أنساب الأشراف (٥: ١١٦)**

اس کے برعکس ابن قتیبہ کے الفاظ بھی اپنی جگہ صریح ہیں کہ خالد عثمان شہادت عثمان کے بعد فوت ہوئے، ابن قتیبہ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مصعب الزبیری نے حضرت عثمان کے ورثہ میں خالد کو شمار کیا ہے، نسب قریش ص ۱۱۲۔

(۳) یہ فقرہ کتاب المعارف میں نہیں ہے، ابن قتیبہ کی دوسری کتاب سے ماخوذ ہے۔

الازہار المربوعہ

(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

اب ناظرین اور مجیب غور کریں کہ اگر اصل روایت میں ثلاثاً ہوتا اور بتہ کی روایت بالمعنی ہوتی، تو چونکہ ثلاث کو بتہ کہنا اہل مدینہ کا محاورہ ہے، اس لیے حدیث ابن عباس میں جس کے راوی مدنی ہیں، بتہ کا لفظ ہونا چاہئے، اور حدیث رکانہ میں جس کے راوی مدنی نہیں ہیں ثلاثاً ہونا چاہئے، مگر ایسا نہیں ہے؛ پس تعجب ہے کہ مجیب نے یا جس کسی نے بتہ کو روایت بالمعنی کہا، اس نے یہ نہیں سوچا کہ جب اہل مدینہ جن کے محاورہ میں ثلاث کو بتہ کہتے ہیں، وہ صاف صاف ثلاثاً کہہ رہے ہیں، اور غیر اہل مدینہ جن کا ثلاث کو بتہ کہنا ثابت نہیں ہے، بتہ کا لفظ روایت کرتے ہیں، تو ایسی حالت میں بتہ کے روایت بالمعنی ہونے کا امکان کہاں ہے؟ مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ اسی کو کہتے ہیں۔

اب ابن حجر کی دعویٰ کی معقولیت ملاحظہ کیجئے، وہ گویا یہ فرماتے ہیں کہ اصل روایت میں بتہ ہے، مگر چونکہ اہل مدینہ بتہ تین کو کہتے ہیں، اس لیے کسی راوی نے بتہ والی روایت سن کر بتہ کا معنی تین سمجھ لیا اور ثلاثاً روایت کر دیا، اسی وجہ سے مدینہ والوں (ابن اسحٰق وداؤد) کی روایت میں ثلاثاً ملتا ہے اور غیر اہل مدینہ بتہ روایت کرتے ہیں۔ کتنی معقول بات ہے، مگر مجیب صاحب وغیرہ کے سمجھ میں نہیں آئی۔ باقی نہایہ کے حوالہ سے جو بات مجیب نے لکھی ہے اس میں تو کمال ہی کر دیا ہے، مجیب صاحب دوسروں کو خیانت کا جھوٹا الزام دینے کے لیے بے چین رہتے ہیں، لیکن اپنی اس حرکت کو نہ معلوم وہ کیا کہتے ہیں کہ نہایہ کا ایک ٹکڑا جو اول وآخر دونوں طرف سے ناقص ہے نقل کیا اور صاحب نہایہ کی تصریح کے خلاف اس سے یہ ثابت کیا کہ طلاق ثلاثہ کو بتہ کہتے تھے؛ حالانکہ صاحب نہایہ نے اس ٹکڑے سے پہلے یہ بتایا ہے کہ بت بمعنی قطع آتا ہے، پھر اس کی بعض مثالیں پیش کی ہیں، پھر یہ فقرہ ہے جس کو مجیب نے نقل کیا ہے، چنانچہ اس فقرہ میں ومنــہ کی ضمیر کا مرجع وہی بت بمعنی قطع ہے، جس کو مجیب نے ظاہر

نہیں کیا ہے (یہ جانب ابتدا کا نقص ہے) اور اس فقرہ کے بعد صاحب نہایہ نے بتة کی شرح **قاطعة** سے کر دی ہے، اس کو بھی مجیب ہضم کر گئے ہیں۔

بہر حال اب وہ فقرہ یوں ہے: **ومنہ الحدیث طلقھا ثلاثاً بتة ای قاطعة**، اس سے ظاہر ہو گیا کہ بتة ثلاث کی صفت ہے، تفسیر کہنا غلط بیانی ہے، اور بتة کا معنی تین (ثلاث) ہونا نہایہ سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ بتة کا معنی قاطعة نہایہ سے ثابت ہوتا ہے؛ پس نہایہ کے حوالہ سے اس کے خلاف کا دعویٰ کرنا دوسری غلط بیانی ہے۔

(آثار) امام احمد کے قول سے یہ بھی ثابت ہوا کہ بتة والی روایت نہایت ہی ضعیف ہے الخ۔

(جواب) مجیب نے امام احمد کا جو قول نقل کیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ ''حدیث رکانہ ثابت نہیں'' اور ایک قول میں ہے کہ ''حدیث رکانہ کچھ نہیں''، کچھ نہ ہونے کی دلیل مجیب کے ارشادات کی روشنی میں یہ ہے کہ ابن اسحاق نے بجائے بتہ کے تین طلاق دینا روایت کیا ہے اور ''اہل مدینہ تین کو بتہ کہتے تھے'' لہٰذا بتہ والی حدیث روایت بالمعنی ہوگی۔ سبحان اللہ! کتنی معقول دلیل ہے! زمین کی گولائی کی دلیل بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے، اگر رکانہ کی حدیث کے لاشي ہونے کی یہی دلیل ہے، تو پھر میں کہتا ہوں کہ حدیث ابن اسحاق کچھ نہیں ہے، اس لیے کہ نافع اور عبداللہ بتہ روایت کرتے ہیں، اگر فرماتے کہ ابن اسحاق کا ثلاثاً روایت کرنا ہی دلیل نہیں ہے بلکہ اہل مدینہ کا تین کو بتہ کہنا بھی دلیل کا ایک جزو ہے، تو عرض ہے کہ اب بھی اس دلیل سے ابن اسحاق ہی کی روایت کا لاشي ہونا ثابت ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ نافع اور عبداللہ نے لفظ بتہ سے روایت کیا ہے اور اہل مدینہ ثلاث کو بتہ کہتے ہیں، اس لیے ابن اسحاق جو مدنی ہیں انھوں نے بتہ کا معنی ثلاث سمجھ لیا اور جو سمجھا وہی روایت کر دیا، لہٰذا ثلاثاً والی روایت بالمعنی ہے۔ اس تقریر سے ابن اسحاق کی حدیث کا لاشي ہونا ثابت ہو گیا، لیکن اس دلیل سے حدیث رکانہ کا لاشي ہونا کبھی ثابت نہیں ہو سکتا، تا وقتیکہ مجیب یہ نہ ثابت کریں کہ بتہ کے روایت کرنے والے مدنی ہیں، یا ابن اسحاق بتہ کے روایت کرنے والے اور نافع وغیرہ ثلاثاً کے راوی ہیں۔ اس لیے میں مجیب کے انداز میں کہتا ہوں کہ حدیث رکانہ کے لاشي ہونے کی جو دلیل ذکر کی گئی ہے واللہ ایسی مہمل بات تو کوئی پاگل بھی نہیں کہہ سکتا............ اس غلط در غلط بات کی نسبت امام احمد رحمہ اللہ کی طرف کرنا امام ممدوح کی کھلی ہوئی توہین ہے، یقیناً عبارت کچھ اور تھی اور اب اس کی صورت مسخ ہو گئی ہے کہ عقل

سلیم اس کو امام کی طرف منسوب کرنے سے انکار کرتی ہے، یا یہ امام کا قول ہی نہ ہو بلکہ کسی حاسد نے امام ممدوح کو بدنام کرنے کے لیے لکھ دیا ہو۔ (آثار ص۵۲ بادنی تصرف)

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں لکھا ہے: **أثبت ما روی فی قصة رکانة أنه طلقها البتة لا ثلاثاً** یعنی سب سے زیادہ صحیح وثابت روایت رکانہ کے قصے میں یہ ہے کہ انھوں نے لفظ بتہ سے طلاق دی۔ اعلام ص۲۰

شوکانی کی عبارت سے ترجیح بتہ کا ثبوت اور مجیب کے تخیلات فاسدہ کا جواب:

صاحب آثار لکھتے ہیں:

بے شک موجودہ نیل الاوطار میں یہ عبارت یونہی ہے، لیکن یہ بھی ابوداؤد کی عبارت کی طرح بے معنی ہے، چونکہ شوکانی قائلین ثلاث کے جواب میں اس عبارت کو لکھتے ہیں اور نیل الاوطار کی موجودہ عبارت کی بنا پر یہ مطلب ہوا کہ بتہ والی روایت کا جواب یہ ہے کہ بتہ والی روایت بہت صحیح ہے .... دنیا اس کو جواب نہیں کہہ سکتی ـ ـ ـ ـ میں علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ شوکانی کی عبارت میں قلب ہے .... اس پر نہایت زبردست اور اٹل قرینہ یہ ہے کہ اس کے بعد دوسرا جواب دیتے یا پہلے کی تائید میں فرماتے ہیں کہ بتہ والی روایت میں جو خرابیاں اور جرحیں ہیں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور ان خرابیوں کے ہوتے ہوئے بتہ والی روایت استدلال کے قابل نہیں .... پس اب شوکانی یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ بتہ والی روایت صحیح ہے (آثار ص۵۶-۵۷ باختصار وتصرف)

(جواب) کیا اب بھی مجیب صاحب کے ہوا خواہ ان کی اعلی قابلیت اور مناظرہ میں ان کی غیر معمولی مہارت وغیرہ کے قائل نہ ہوں گے، سبحان اللہ! ابوداؤد کی عبارت غلط اور مسخ ہے، شوکانی کی عبارت غلط ہے، ابن حجر کی عبارت (جو آگے آئے گی) غلط ہے، مناظرہ کا کتنا اچھوتا طریقہ ایجاد کیا ہے کہ جس بات کا جواب نہ آئے اس کی نسبت دعویٰ کر دیجئے کہ جہاں وہ بات لکھی ہے وہاں عبارت غلط ہے، مسخ ہوگئی ہے اور اس میں قلب ہو گیا ہے، پس چلئے قصہ ختم ہوا۔ اس لیے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ کسی صحیح نسخہ سے صحیح عبارت پیش کر کے غلطی کا دعویٰ کیجئے، صرف اپنے تخیل سے غلط کہہ دیجئے جواب ہو جائے گا۔ نیز اس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ایسی غلطی کا دعویٰ کیجئے جو نفس مسئلہ پر

اثر انداز ہو، بلکہ اس کی بھی ضرورت نہیں کہ کوئی معنوی غلطی ہو، بس اتنا کافی ہے کہ صاحب اس عبارت میں ایک ب ہے جس کے نیچے دو نقطے دے دیئے ہیں اور ایک قاف ہے جس پر نقطے ہی نہیں ہیں اور ایک حرف زائد لکھ گیا ہے جو نہ ہونا چاہئے، اتنا کہہ دیجئے عبارت کی غلطی ثابت اور جواب سے سبکدوشی حاصل۔

اگر واقعی عبارت میں کوئی غلطی موجود ہے جب بھی اس انداز جواب کے مضحکہ خیز ہونے میں کلام نہیں، لیکن اگر غلط بھی نہ ہو تب تو پھر پوچھنا ہی کیا! مجیب صاحب کے دعویٰ کی شکل بھی یہاں یہی ہے کہ فی الواقع شوکانی کی عبارت میں نہ کوئی غلطی ہے نہ قلب واقع ہوا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شوکانی کی عبارت پڑھ کر مجیب صاحب کے دل ودماغ میں قلب وانقلاب پیدا ہو گیا ہے، اور اسی کا عکس عبارت میں ان کو نظر آرہا ہے، مجیب صاحب کو بڑی پریشانی یہ لاحق ہے کہ اگر نیل الاوطار کی موجودہ عبارت صحیح ہو تو اس سے قائلین ثلاث کا جواب کیونکر ہوگا، لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ بات تو اس عبارت کو غلط مان لیجئے جب بھی موجود رہتی ہے، آپ کے تخیل وتوہم کی بنا پر اس عبارت کو یوں ہی بنا لیجئے طلّقها ثلاثاً البتة یعنی تین طلاق دی نہ لفظ بتہ سے، اس جواب کو شاید آپ ہی جواب کہیں، دنیا تو اس کو جواب نہیں کہہ سکتی، اس لیے کہ رکانہ کے قصہ میں ثلاثاً کو صحیح کہنا کسی ایسے شخص سے ممکن نہیں جس کو فن حدیث کی مہک دور سے بھی پہنچی ہے۔

اس کے علاوہ یوں بھی شوکانی کے اس جواب کو کوئی شخص جواب نہیں کہہ سکتا کہ مجیب کی تصحیح عبارت کے بعد اب استدلال وجواب کا حاصل یہ ہے: (استدلال) آنحضرت ﷺ نے رکانہ سے قسم لی کہ انھوں نے بس ایک ہی طلاق کا تو ارادہ کیا ہے، پس یہ قسم لینا دلالت کرتا ہے کہ اگر انھوں نے تین کا بھی ارادہ کیا ہوتا تو تین بھی واقع ہو جاتی۔ (جواب استدلال) سب سے صحیح روایت رکانہ کے قصہ میں یہ ہے کہ انھوں نے تین طلاق دی نہ لفظ بتہ سے۔

ناظرین غور کریں کہ یہ کیا جواب ہوا۔ اچھا صاحب! رکانہ نے تین ہی طلاقیں دیں، لفظ بتہ سے طلاق نہیں دی، جب بھی تو ہمارا استدلال اسی طرح قائم ہے کہ حضرت رکانہ کے تین طلاقیں دینے کے بعد آنحضرتؐ کا ان سے ایک ہی طلاق کے ارادہ کی قسم لینا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر تین کا ارادہ کرتے تو تینوں واقع ہو جاتیں، کہئے مجیب صاحب شوکانی کی عبارت کی تخئیلی تصحیح سے آپ کو کوئی فائدہ

نہیں پہنچا اور شوکانی کا جواب پھر بھی غلط کا غلط ہی رہا۔

آپ اس کی فکر کہاں تک کریں گے کہ اگر یہ عبارت صحیح مانی جائے تو جواب کیونکر درست ہوگا، آخر جس عبارت میں آپ بھی کوئی غلطی نہیں مانتے اسی عبارت میں جو جواب استدلال مذکور کا شوکانی نے دیا ہے، اسی کو دنیا کب جواب کہتی ہے۔ میری مراد وہ عبارت ہے جس کو آپ دوسرا جواب یا پہلے کی تائید کہتے ہیں، غور کیجئے شوکانی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں پہلے ایسا کلام ہو چکا ہے جس کی وجہ سے وہ استدلال کے قابل نہیں، اور پہلے جو کلام کیا ہے وہ اضطراب اور معارضہ کا دعویٰ ہے، لیکن خود ہی شوکانی نے بخاری وابوداؤد کے حوالہ سے اضطراب کا دفعیہ یہ پیش کر دیا ہے کہ بتہ کو ترجیح ہے، اور ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ ترجیح کے بعد اضطراب نہیں رہتا اور معارضہ کا دعویٰ مضر نہیں ہوتا۔ لہذا یہاں پر اگر انھیں دونوں علتوں کی وجہ سے اس حدیث کو ناقابل استدلال کہہ رہے ہیں، تو اس کی غلطی خود ان کے بیان سے ہی ظاہر ہے، اور اگر زبیر بن سعید کے ضعف کی طرف اشارہ ہے تو اس کا بھی شوکانی ابن کثیر کے حوالہ سے جواب دے چکے ہیں کہ ابوداؤد نے زبیر کے علاوہ دوسرے طریقہ سے بھی اس کو روایت کیا ہے، لہذا یہ حدیث انشاءاللہ حسن ہے، پس اس وجہ سے بھی ناقابل استدلال کہنا خود ان کے ہی بیان سے غلط ہے۔

پھر اسی ایک مقام پر کیا منحصر ہے، علامہ شوکانی کے کلام میں ایسے بیش بہا نوادر اس کثرت سے موجود ہیں جن کو شمار کیا جائے تو ایک ضخیم رسالہ تیار ہو سکتا ہے، مثلاً یہ فرمانا کہ ابن اسحاق کی روایت ثلاثاً کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے، حالانکہ ابن تیمیہ نے فرمایا ہے اور اس کو ابن القیم، پھر ڈیانوی نے نقل کیا ہے کہ ابوداؤد نے اس کو روایت نہیں کیا ہے۔

ایک لطیفہ: ناظرین کو حیرت ہوگی کہ ابوداؤد کا اس کو روایت کرنا مشاہدہ سے اور ابوداؤد کی مراجعت سے معلوم ہو سکتا ہے، تو اس کے لیے کسی کا حوالہ دینے کی کیا ضرورت ہے، لیکن ناظرین کو معلوم نہیں کہ ہمارے مجیب اس صورت میں جھٹ یہ کہہ دیتے کہ تمام نسخے ابوداؤد کے غلط ہیں، شوکانی کے نسخہ میں یہ حدیث ضرور موجود تھی اور اب شاید نہ کہہ سکیں۔

اسی طرح شوکانی کا یہ فرمانا کہ ابن عباس کی روایت جس میں ابورکانہ وام رکانہ کا نام آیا ہے اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، مسند احمد کوئی نایاب کتاب نہیں ہے، کسی کو

ہمت ہو تو یہ روایت مسند احمد میں نکال کر دکھا تو دے۔ غرضیکہ ایسی مثالیں بکثرت شوکانی کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ مجھے ان مثالوں کا استقصا یہاں پر منظور نہیں ہے، بلکہ صرف یہ سمجھانا مقصود تھا کہ صرف اتنی بات پر کہ اگر عبارت میں قلب نہ مانا جائے تو جواب نہیں ہوتا، قلب ماننے کی ضرورت نہیں ہے؛ اس لیے کہ قلب ماننے کے بعد وہی بات باقی رہتی ہے اور جہاں آپ قلب وغیرہ نہیں مانتے وہاں بھی یہ بات موجود ہے، اس لیے نیل الاوطار کو آپ اس کے حال پر رہنے دیجئے، وہ آپ کے درست کیے درست نہیں ہوسکتی۔ **و لن یصلح العطار ما أفسدالدهر**

باقی جیسا لغو جواب قلب ماننے کے بعد قائلین ثلاث کا ہو جاتا ہے ویسا تو قلب مانے بغیر بھی ہو جاتا ہے، اصل یہ ہے کہ مجیب کو اپنے گھر کی بھی خبر نہیں ہے، میں بخدا کہتا ہوں کہ نیل الاوطار وغیرہ جن کو مجیب صاحب اپنی مخصوص مذہبی کتابیں تصور کرتے ہیں، ان کے معانی ومطالب سے بھی وہ ایسے ہی ناآشنا ہیں جیسے دوسری کتابوں کے مطالب سے، جس کی ایک بین دلیل یہی دعویٰ قلب عبارت ہے، بیچارے علامہ مجیب کو خبر تو ہے نہیں کہ شوکانی کا مذہب بتہ اور ثلاث کے باب میں کیا ہے، اس لیے شوکانی کا جواب ان کی سمجھ میں نہ آیا اور قلب کا دعویٰ کر بیٹھے۔ بہر حال مجیب کو معلوم ہونا چاہئے کہ شوکانی کے نزدیک لفظ بتہ سے طلاق دے کر تین کا ارادہ کرنے میں اور تین لفظوں میں تین صریح طلاقیں دے کر تینوں کی نیت کرنے میں فرق ہے، پہلی صورت میں ان کے نزدیک تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور دوسری صورت میں نہیں واقع ہوتیں، اس لیے انھوں نے مستدل کو جواب دیا کہ رکانہ کے واقعہ میں لفظ بتہ سے طلاق دینا صحیح ہے نہ کہ تین طلاق دینا، پس تمھارا استدلال درست نہیں ہے، اس لیے کہ لفظ بتہ سے تین کی نیت کرنے سے تین واقع ہو جانے کی یہاں بحث نہیں ہے، بحث تو تین طلاق دینے اور ان کے واقع ہونے میں ہے اور وہ ثابت نہیں، شوکانی کے اس جواب کی سخافت میں آگے ظاہر کروں گا۔ اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ شوکانی کا مذکورہ بالا فرق کہاں سے ظاہر ہوتا ہے، سنیے ج ۶ ص ۱۵۱ میں لکھتے ہیں: **والحديث يدل على أن من طلق البتة وأراد واحدة كانت واحدة، وإن أراد ثلاثاً كانت ثلاثاً ورواية ابن عباس التي ذكرنا ها انه اعنى ركانة طلقهاثلاثاً فامره صلى الله عليه وسلم بمراجعتها يدل على ان من طلق ثلاثاً دفعة كانت في حكم الواحدة وسياتي الخلاف في ذلك وبيان ما هو الحق.** یعنی حدیث (بتہ) دلالت کرتی ہے

کہ جو شخص لفظ بتہ سے طلاق دے اور ایک کا ارادہ کرے تو ایک ہوگی اور اگر تین کا ارادہ کرے تو تین ہوگی، اور ابن عباس کی حدیث جو ہم نے ذکر کی یعنی یہ کہ رکانہ نے اپنی بی بی کو تین طلاقیں دیں پس آنحضرت نے رجعت کا حکم دیا، تو یہ دلالت کرتی ہے کہ جو ایک ہی دفعہ میں تین طلاقیں دے دے تو یہ تینوں ایک کے حکم میں ہوں گی اور اس میں اختلاف آئے گا اور حق کا بیان بھی۔

شوکانی کی یہ عبارت محتاج تشریح نہیں ہے، بتہ اور ثلاث میں شوکانی جو فرق کرتے ہیں وہ اس سے صاف ظاہر ہے، اب مجیب کو چاہئے کہ اس عبارت کو پڑھنے کے بعد شوکانی کا جواب پڑھیں اور دیکھیں کہ قائلین ثلاث کا قاضی شوکانی کے نقطۂ نظر سے جواب ہو جاتا ہے یا نہیں۔

اب رہی اس جواب کی سخافت تو وہ اظہر من الشّمس ہے، اس لیے کہ جب لفظ بتہ سے تین طلاقوں کا ارادہ کرنے سے تینوں واقع ہو جاتی ہیں اور کسی نص نبوی کی مخالفت لازم نہیں آتی نہ مصالح طلاق کے خلاف یہ بات ہوتی، تو پھر تین لفظوں سے طلاق دینے میں ہی یہ خرابیاں لازم نہ آئیں گی اور وہ بھی ضرور واقع ہوں گی، ورنہ وجہ فرق بیان کی جائے۔ اس جواب کی سخافت میں نے ضمناً بیان کر دی ہے، میری غرض تو درحقیقت یہ ہے کہ شوکانی نے حدیث بتہ کو اثبت کہا ہے اور ان کی عبارت غلط نہیں ہے اور وہ بہر حال ثابت ہے، چاہے جواب شوکانی سخیف ہو یا کچھ اور۔ اس کے بعد ناظرین کو ایک بات اور بتانی ہے اور وہ یہ کہ جو عبارت میں نے نیل الاوطار سے اعلام میں نقل کی ہے اور وہ جس کو مجیب دوسرا جواب یا پہلے کی تائید کہتے ہیں، ان دونوں کے درمیان میں ایک اور عبارت بھی ہے، جس کو مجیب صاحب کھا گئے ہیں، حالانکہ وہی عبارت دوسرا جواب کہلانے کی مستحق ہے، اور جس کو مجیب نے دوسرا جواب بتایا ہے اس کو درحقیقت تیسرا جواب کہنا چاہئے۔ خیر! میرا مقصود یہ ہے کہ مجیب صاحب نے اپنے مخصوص کیریکٹر کے ماتحت اس عبارت کا کوئی ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ وہ عبارت ان کے گھروندے کو بگاڑ کے رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ وہ عبارت اپنے ماقبل کی عبارت کے ساتھ یوں ہے: **ویجاب بان اثبت ما روی فی قصة رکانة انه طلقها البتة لا ثلاثاً وأیضاً قد تقدم فی روایة انه صلی الله علیه وسلم قال له ارجعها بعد ان قال له انه طلقها ثلاثاً**، یعنی جواب دیا جاتا ہے کہ رکانہ کے قصہ میں صحیح تر بات ہے کہ انھوں نے لفظ بتہ سے طلاق دی نہ کہ تین، نیز ایک روایت میں گزر چکا ہے کہ آنحضرت نے ان کو یہ کہنے پر بھی رجعت کرنے کو کہا کہ میں نے تین طلاقیں دی ہیں۔ یہ تو اصل عبارت کا ترجمہ ہے لیکن مجیب کی ترمیم کے بعد پہلا

جواب یہ ہوگا کہ واقعہ رکانہ میں تین طلاق دینا صحیح تر بات ہے نہ کہ لفظ بتہ سے۔

اب میں مجیب سے پوچھتا ہوں کہ آپ کی ترمیم کے بعد پہلے جواب اور دوسرے میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ آپ کی ترمیم کے بعد عبارت کا جو مفہوم ہوگا اتنے ہی سے تو جواب ہوگا نہیں، اس لیے کہ کہنے والا کہہ دے گا کہ اچھا ثلاثاً ہی اصح ہے تو کیا ہوا۔ اس کے بعد خواہ مخواہ آپ کہیں گے کہ جب ثلاثاً کو اصح مان لیا تو اب سنو کہ جس روایت میں ثلاثاً آیا ہے اس میں مذکور ہے کہ آنحضرت نے رجعت کا حکم دیا ہے، لہذا اب رکانہ کے واقعہ سے استدلال صحیح نہیں ہے اور جب آپ پہلے جواب کی یہ تقریر کریں گے تو پہلے اور دوسرے میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا، پس اس تکرار بے کار کا آپ شوکانی کی طرف سے کیا جواب دیں گے؟ اور اگر کچھ بات بھی بنائے تو الفاظ شوکانی وایضاً وغیرہ کب بات بننے دیں گے؟ علاوہ بریں اگر آپ کی ترمیم صحیح ہے تو اس صورت میں **فی روایة** کی تنکیر بے موقع ہوجائے گی، بلکہ **فی روایة** کا ذکر ہی لغو ہوجائے گا، **کما لا یخفی علی من له ادنی درایة.**

اس تفصیلی بیان سے معلوم ہوگیا کہ مجیب نے اپنے ہویٰ کی تقلید میں اشہب قلم کو بے لگام چھوڑ دیا اور آگے پیچھے کی عبارت سے قطعاً بے پروا ہوگئے اور بے سمجھے بوجھے شوکانی کی عبارت کو غلط اور الٹی پلٹی کہہ دیا، باقی رہا مصری صاحب کا ذکر تو یہ افترا اور غلط بیانی پہلے بھی دوبار کر چکے ہیں اور ممکن ہے پھر اس کا اعادہ کریں، مجیب صاحب کے نزدیک اعلام مرفوعہ کے قاہر مضامین کا یہ ایسا لاجواب رد ہے کہ تنہا وہی نہیں اس سے قند مکرر کا مزہ لیتے ہیں، بلکہ ان کے مشیر خوار تلامذہ کے کام ودہن بھی مصری صاحب کے ذکر سے مصری کی ڈلی کا لطف حاصل کرتے ہیں، میں ان لوگوں کو معذور تصور کرتا ہوں کہ ان کا دائرۂ علم وکمال اس سے بھی محدود تر ہے، اور ان کی ہمت علیا کی پرواز یہیں تک ہے، کنویں کی تہ میں رہنے والا سمندر کی گہرائیوں اور اس کی پہنائیوں کا تخیل بھی نہیں کرسکتا **والحمد لله حمداً كثيراً يكافي نعمه ويوافي مزيده**

(جاری ہے)

ماخوذ از: بانگ حراء

قرآن کریم کا نیا نسخہ-العیاذ باللہ

مولانا شمس تبریز قاسمی

قرآن مقدس ایک آفاقی پیغام ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے حضور پاک ﷺ پر نازل ہونے والی مقدس وحی کا مجموعہ ہے۔ پوری دنیا کے لیے مشعل راہ اور تمام علوم کا خزانہ ہے۔ اس میں ذرہ برابر بھی کسی کو کسی بھی طرح کے تغیر وتبدل کا کوئی حق نہیں دیا گیا ہے، تمام مذاہب کے درمیان قرآن مجید واحد کتاب ہے جو ہر طرح کے ردو بدل، تغیر وتبدل، نسخ وتنسیخ اور تحریف سے پاک ہے۔ مذہب اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ میں کسی بھی شخص نے قرآن کریم کے ساتھ یہ گستاخی نہیں کی۔ العیاذ باللہ کسی مسلمان نے اپنے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں سوچی کہ یہ قرآن دہشت گردی کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ یہ دنیا کے لیے خطرہ کی گھنٹی ہے۔ عالمی امن وسلامتی کو اس سے خطرہ لاحق ہے۔ محمد عربی ﷺ پر نازل ہونے والی یہ کتاب دین اسلام کی بدنامی کا سبب بن رہی ہے۔ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی بدامنی کی وجہ یہ قرآن کریم ہے۔ امن وسلامتی، اخوت وبھائی چارگی کے فروغ اور انتہا پسندی کے خاتمہ کا واحد حل یہ ہے کہ محمد عربی ﷺ پر نازل ہونے والا قرآن منسوخ قرار دے دیا جائے اور اس کی جگہ قرآن کا ایک نیا نسخہ لایا جائے۔

لیکن آج یہ بھی ممکن ہو چکا ہے۔ دنیا کو دہشت گردی سے پاک کرنے کے لیے قرآن کریم کا ایک دوسرا نسخہ جاری کر دیا گیا ہے، جس کا نام ''قرآن کریم کا معیاری نسخہ'' ہے۔ جی ہاں یہ کام کسی غیر مسلم نے انجام نہیں دیا ہے۔ قرآن کریم میں تحریف کی ناپاک اور بدترین کوشش کسی اسلام دشمن امریکہ اور یورپ سے تعلق رکھنے والے شخص نے نہیں کی ہے، بلکہ یہ جسارت شام کے صدر جناب بشار الاسد نے کی ہے۔ اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ میں جس کام کی طرف کسی بھی مسلم حکمراں کا ذہن وگمان تک نہیں گیا، بشار الاسد صاحب نے وہ انوکھا کام بھی کر کے تاریخ کا ایک اور منفرد باب اپنے نام درج کر لیا۔

جب وہاٹس اپ کے ذریعے مجھے یہ خبر ملی تو پہلی فرصت میں میرے ذہن میں یہ بات آئی

کہ خبر فرضی ہے۔ عالم اسلام کے جذبات کو مشتعل کرنے اور انھیں مسلم حکمرانوں کے خلاف برانگیختہ کرنے کی سازش ہے۔ بھلا یہ کام ایک مسلمان کیوں کر کرسکتا ہے۔ اس کی تحقیق کے لیے میں نے انٹرنیٹ پر سرچ کیا تو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ یہ خبر دنیا بھر کے اخبارات میں چھپی ہوئی ہے۔ اکثر جگہ شام کی سب سے بڑی نیوز ایجنسی ''سیرین عرب نیوز ایجنسی'' کا حوالہ ہے۔ اس وقت آٹھ زبانوں پر مشتمل سیرین عرب نیوز ایجنسی کی ویب سائٹ میرے سامنے کھلی ہے، جس کے مطابق ''شامی صدر نے شام کے مذہبی امور واوقاف کے وزیر سید عبدالستار کو یہ حکم دیا تھا کہ قرآن کریم کا نیا معیاری ورژن تیار کریں۔ جنھوں نے علماء کی ایک ٹیم کے ساتھ پانچ سال کی محنت اور ۲۷ مرتبہ نظر ثانی کے بعد یہ نسخہ تیار کر کے بشارالاسد کے حوالے کر دیا ہے۔ یہ شام میں سرکاری طور پر نافذ العمل ہوگا اور اسی کا حوالہ معتبر ہوگا۔ اصل قرآن کریم کو کالعدم قرار دیا جائے گا۔ اس نسخہ کو جاری کرتے ہوئے بشارالاسد کا کہنا تھا کہ ''تحریف اور گمراہی کے اس نازک دور میں ہمیں اس طرح کے اعمال کی واقعی ضرورت ہے۔''
(14 جولائی 2015 Syrian Arab News Agency)

خبروں کے مطابق بشارالاسد نے اپنے اس ''نئے قرآن'' کا آغاز شب قدر کی فضیلتوں پر مشتمل آیتوں سے کیا ہے تا کہ انوار و برکات اور روحانی پیغام کا اثر برقرار رہے، شام کے ایک دوسرے اخبار کے مطابق یہ نسخہ ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے اور سرکاری اداروں میں اس کی تقسیم کا عمل جاری ہے۔ یہ نسخہ جامع ازہر مصر کو بھی بھیجا جائے گا تا کہ مصر میں اسے سرکاری طور پر نافذ کرنے کا فتویٰ جاری کیا جائے۔ ساتھ ہی دیگر عرب ممالک میں بھی آہستہ آہستہ اسے فروغ دینے کی کوشش کی جائے گی، بقول بشارالاسد کے مشرق وسطی میں جاری خانہ جنگی کے خاتمہ میں یہ کتاب موثر رول ادا کرے گی۔

بشارالاسد کی طرف سے جاری کیے گئے اس قرآنی نسخہ میں کیا ہے؟ کس طرح کا مواد ہے؟ قرآن کریم سے بھی کچھ لیا گیا ہے یا یہ مکمل طور پر ان علماء کا کلام ہے جنھیں یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی، بسیار تلاش وجستجو کے باوجود بھی مجھے اس سلسلے میں کوئی تفصیل نہیں مل سکی ہے۔ البتہ صرف سورہ اخلاص کی تفصیل بعض عربی اخبارات میں ملی ہے، جس میں انھوں نے تحریف کی ہے۔ اللہ کی وحدانیت کی دلیل پر سب سے ممتاز اور منفرد سورت میں انھوں نے تحریف کر کے اسے اپنے نام سے منسوب کر کے اس کا نام ''سورۃ الاسد'' رکھا ہے۔ اور تحریف کچھ یوں کی گئی ہے۔ پہلے آپ سورہ احد کی تلاوت کر لیں جو آپ کو یاد ہوگی، پھر بشارالاسد کے قرآن میں اس سورت کو دیکھیں: ''**قل ھو اللہ احد ، اللہ**

الصمد لم یخلق مثل حافظ الاسد و لم یحکم سوریة البلد، الا بشار الاسد''

العیاذ باللہ تحریف کا یہ ایک نمونہ ہے، نہ جانے بقیہ کا کیا حال ہوگا۔ شام میں مختلف مقامات پر سورہ احد میں تحریف کر کے اس عبارت کے فلیکسی بورڈ بھی لگائے گئے ہیں: ''**قل هو الله احد، الله الصمد، عز الله شعبی، فاصطفی منه الاسد**''

قرآن کریم میں تحریف کی یہ کوئی پہلی کوشش نہیں ہے، ۲۰۰۷ میں امریکہ نے بھی قرآن کے متبادل کے طور پر کتاب ''فرقان'' جاری کیا تھا، جس میں جہاد کو حرام قرار دیا گیا تھا۔ چند سالوں قبل برطانیہ نے یہ آواز اٹھائی تھی کہ قرآن کریم کی چوبیس آیتیں دہشت گردی پر مبنی ہیں جنھیں نکال دیے جانے کے بعد ہم اسے قبول کرلیں گے۔ کچھ نے اسے مٹانے کے لیے اوچھی حرکتیں کیں، نذر آتش کیا۔ بے حرمتی کی لیکن کسی کی کوئی بھی کوشش کامیابی سے ہم کنار نہ ہوسکی، جس نے بھی قرآن کے ساتھ ذرہ برابر بھی کسی طرح کی بے حرمتی اور گستاخی کی انہیں دنیا میں عبرتناک سزا مل گئی، لیکن شام کے صدر بشارالاسد کی یہ کوشش مذکورہ بالا حرکتوں سے جدا ہے۔ کتاب فرقان مستقل ایک کتاب تھی۔ اس میں قرآن کے بعض احکامات کی تردید ضرور کی گئی تھی، لیکن آیتوں میں تحریف نہیں کی تھی، جب کہ بشارالاسد نے پورے قرآن کو ہی غلط ٹھہرادیا۔ اپنی مرضی کے مطابق پورا قرآن تیار کرلیا۔ جہاں پر اللہ کی وحدانیت بیان کی گئی ہے وہاں اپنا نام ایڈ کردیا ہے۔ جہاں پر خدائی اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہاں اسد خاندان کی حکمرانی کی تعریف کی گئی ہے۔

مذہب اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ میں قرآن کریم کے ساتھ اتنی بڑی گستاخی اور اس کی پامالی آج تک کسی مسلم یا غیر مسلم نے نہیں کی ہے۔ لیکن بشارالاسد نے انسانیت کے قتل عام کے ساتھ مسلمانوں پر تحریف قرآن کا یہ داغ بھی لگادیا۔ انٹرنیٹ پر اس سلسلے میں لکھے گئے ایک مضمون کی ابتدا صاحب مضمون نے کچھ یوں کر رکھی تھی کہ جن آسمانی کتابوں پر تحریف شدہ ہونے کا الزام ہے اس میں اب قرآن بھی شامل ہوگیا ہے۔ گویا بشارالاسد نے اپنے اس کارنامے سے ہمارے اس امتیاز پر بھی داغ لگادیا ہے کہ قرآن واحد کتاب ہے جس کا کوئی تحریف شدہ نسخہ نہیں پایا جاتا ہے۔

لیکن اس سے قرآن کریم کا بال بیکا نہیں ہوگا، اس کی تحریف کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکے گی؛ کیوں کہ قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری پروردگار عالم نے خود لے رکھی ہے۔ **اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوۡنَ** (کہ قرآن کریم کو ہم نے نازل کیا ہے اور یقینی طور پر اس کی حفاظت کے

ذمہ دار ہم خود ہیں)[سورۃ الحجر آیت نمبر ۹] امت مسلمہ سے پروردگار عالم کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ اس کی تعلیمات کو بروئے کار لایا جائے۔ طاقوں میں سجانے کے بجائے اس کی تلاوت کی جائے، زندگی کے ہر مرحلے میں اسے مشعل راہ بنایا جائے۔ یہی اللہ رب العزت کا قرآن کے حوالے سے ہم سے مطالبہ ہے، اسی میں ہماری کامیابی ہے۔ جہاں تک بات ہے قرآن کو تحریف کرنے اور ردوبدل کرنے کی تو ایسی کوششیں نہ کبھی کامیاب ہوئی ہیں نہ ہوسکیں گی۔ ہمارا قرآن وہی ہے جو تیئیس سالوں کی مدت میں حضور پاک ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ جس کی ابتداء سورۂ فاتحہ سے ہوتی ہے اور سورۂ ناس پر اختتام۔ جس کی کل آیتیں ۶۶۶۶ ہیں، ۱۱۴ سورتیں اور تیس پارے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی کتاب کو قرآن نہیں کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی کوئی کلام اس کے عشر عشیر بھی اس کے مثل ہوسکتا ہے۔ عالمی دہشت گردی سے نجات اور امن وآشتی کا پیام قرآن کریم کو اپنائے بغیر ناممکن ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆☆

صفحہ ۶۵ کا بقیہ

ذکر اور نماز میں نشاط پیدا ہوتا ہے۔(۸) مسواک اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور خوشنودی کا سبب ہے اور ملائکہ کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے نیز حسنات میں اضافہ کرتی ہے۔

مسواک کے فوائد میں سے ہے پیشاب کا کھل کر آنا، رطوبت کا ختم ہونا، صفراء کا دور ہونا، دانتوں کی تکلیف اور سر کی رگوں کو سکون ملنا، فہم میں تیزی پیدا کرنا، نماز کے اجر کو دوگنا کرنا، شیطان کو غصہ میں لانا اور موت کے وقت روح کے نکلنے میں آسانی کا ہونا وغیرہ وغیرہ، علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ مسواک کے تیس سے زائد فوائد ہیں (حاشیہ ابن عابدین ج ۱ ص ۱۱۵)

مسواک بری عادتوں کے چھڑانے میں اہم رول ادا کرتی ہے جیسے سگریٹ اور حقہ نقشی اور انگلیوں کا چوسنا جو بچپن کی عادت ہوتی ہے۔ مسواک کے اور بھی دوسرے فوائد ہیں جن کو علماء طب نے اپنی کتابوں میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت وراستی کے دلائل کتاب وسنت سے

تحریر: دکتور محمد بن عبداللہ الوھیبی (پانچویں قسط) ترجمہ: مولانا ازہر رشید الاعظمی

سبِّ صحابہ- رضی اللہ عنہم -کے اثرات ونتائج

سلف صالحین رضی اللہ عنہم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر کیے جانے والے طعن وتشنیع اور سبّ وشتم کی سنگینی اور ان سے پیدا ہونے والے ان مُضِر اثرات ونتائج سے باخبر تھے، جو دین کے اصولوں سے ٹکراتے ہیں، اسی لیے انھوں نے پہلے ہی ان طعنہ زنوں اور ان کے خطرناک مقاصد سے لوگوں کو متنبہ اور ہوشیار کر دیا، چنانچہ بعض علماء نے ان کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتا دی ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود انتہائی جامع ہیں، جن کو میں اس موضوع کے آغاز میں بطور مقدمہ پیش کروں گا، پھر کسی قدر وضاحت کے ساتھ سب وشتم کے عمومی اثرات ونتائج کو بیان کروں گا۔

میری توجہ پہلی اور دوسری قسم کے سبّ وشتم کے جواب پر مرکوز ہوگی، جس میں صحابۂ کرام یا بیشتر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو کافر یا فاسق کہنا ہے، یا ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر طعنہ زنی کرنا ہے، جن کی فضیلت وبزرگی متواتر حدیثوں سے ثابت ہے، جیسے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ان لوگوں کے بارے میں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں بیہودہ گوئی کرتے ہیں، کہتے ہیں: 'یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنی چاہی، لیکن جب وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی عیب جوئی کرنے لگے؛ تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو-نعوذ باللہ- برا آدمی کہا جا سکے، کیونکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اچھے آدمی ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی نیک وصالح ہوتے'[1]۔

---

(۱) رسالة في "حكم سب الصحابة": ۴۶، عن الصارم المسلول: ۵۸۰

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے: 'جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ کسی صحابی کی برائی کرتا ہے تو اس کے اسلام کو مشکوک سمجھو'[۱]۔

اور ابوزرعہ رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: 'جب تم کسی کو رسول اللہ ﷺ کے کسی صحابی کی عیب جوئی کرتے ہوئے دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ بے دین ہے؛ کیونکہ رسول ﷺ ہمارے نزدیک برحق ہیں، اور قرآن بھی برحق ہے، اور ہم تک قرآن وسنت کو آپ ﷺ کے صحابۂ کرام ؓ ہی نے پہنچایا ہے، اور یہ لوگ کتاب وسنت کو بے بنیاد ثابت کرنے کے لیے ہمارے ان گواہوں کو مجروح کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ خود مجروح اور بے دین ہیں'[۲]۔

اور امام ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: 'رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرام ؓ کی لغزشوں اور خطاؤں کی ٹوہ میں لگنے والا اور حالت غضب میں ان صادر ہونے والے واقعات کو محفوظ رکھنے والا وہی شخص ہوگا جس کے دل میں بدعقیدگی اور فتنہ پروری ہے'[۳]۔

نیز آپ نے فرمایا: 'صحابۂ کرام ؓ پر زبان طعن وہی شخص دراز کرے گا جو نبی کریم ﷺ، ان کے صحابۂ کرام ؓ، اسلام اور مسلمانوں کا بدخواہ اور بدطینت ہوگا'[۴]۔

علماء کرام کی یہ تنبیہات تمام صحابۂ کرام ؓ کو شامل ہیں جیسا کہ ان کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے، چنانچہ امام اہل سنت (احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ) کا قول 'یذکر أحداً من الصحابة بسوء' اور ابو زرعہ کا قول 'ینتقص أحداً' دونوں پر غور کرنا چاہئے، جن میں محض برائی کے ساتھ تذکرہ کرنے اور انتقاص (ان کی شان کو گھٹانے) سے بھی ڈرایا اور روکا گیا ہے، اور یہ دونوں الفاظ 'شتم وتکفیر' کے الفاظ سے کمتر ہیں، نیز یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ یہ تنبیہ کل صحابہ ؓ کے بارے میں نہیں، بلکہ کسی بھی ایک صحابی کے بارے میں کی گئی ہے، پھر ایسے شخص کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو بیشتر صحابہ ؓ کو برا بھلا کہتا ہو۔

اور اب میں اپنے قارئین کی خدمت میں سب وشتم کے بعض اثرات ونتائج کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہتا ہوں:

---

(۱) البداية والنهاية: ۱۴۲/۸، نیز دیکھئے المسائل والرسائل المروية عن أحمد في العقيدة للأحمدي: ۳۶۴-۳۶۳/۲ مطبوعہ دار طیبہ
(۲) الكفاية للخطيب البغدادي: ۹۷
(۳) الإمامة لأبي نعيم: ۳۴۴
(۴) الإمامة لأبي نعيم: ۳۷۶

۱:- چند صحابہ کرام -رضی اللہ عنہم- کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر کو کافر و مرتد قرار دینے یا ان کے فسق و فجور کے قائل ہونے کا نتیجہ قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں شکوک وشبہات پیدا کرنا ہے، اس لیے کہ حاملین قرآن وحدیث پر طعن وتشنیع قرآن وحدیث پر حملہ کے مترادف ہے؛ کیونکہ کسی ایسی کتاب پر ہم کیسے اعتماد کر سکتے ہیں جسے ہم تک پہنچانے والے فاسق و مرتد ہیں -والعیاذ باللہ-، چنانچہ جو گمراہ فرقے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بدگوئی کرتے ہیں، ان کے بعض افراد تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر قرآن کی تحریف کا صریح الزام عائد کرتے ہیں، جبکہ ان کے دوسرے افراد اس الزام کو دل میں مخفی اور پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اور یہی معاملہ احادیث نبویہ کے ساتھ بھی ہوگا، جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت وراست بازی کو ہی مورد الزام یا مشکوک ٹھہرا دیا جائے گا، تو حدیثوں کی سندیں بھی ایسی مرسل ومقطوع ہو کر رہ جائیں گی جو قابل حجت نہیں ہوسکتیں، اس کے باوجود ان میں سے بعض لوگ قرآن پر ایمان کے مدعی ہیں۔ ہم ایسے لوگوں سے عرض کرنا چاہیں گے کہ قرآن پر ایمان لانا مستلزم ہے اس کے مضامین پر ایمان لانے کو، اور تمھیں یہ بات معلوم ہے کہ قرآن میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ سب امتوں سے بہتر ہیں، اور یہ کہ اللہ تعالی انھیں ذلیل ورسوا نہیں کرے گا، اور یہ کہ اللہ تعالی ان سے راضی ہوا، وغیرہ وغیرہ۔ پس جو شخص صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں قرآن کی ان باتوں کی تصدیق نہیں کرتا وہ قرآن کی باتوں کو جھٹلانے والا اور اپنے دعوی کی خلاف ورزی کرنے والا ہے۔

۲:- صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر دشنام طرازی اور ان کی شان میں گستاخی سے یہ لازم آئے گا کہ یہ امت -والعیاذ باللہ- لوگوں کے لیے برپا کی جانے والی بدترین امت ہے، اور اس امت کے سابقین اور پیش رَو تو اس کے بدترین افراد تھے، اور اس امت کے بہترین دور قرن اول کے بیشتر افراد کافر یا فاسق وفاجر تھے، اور قرن اول بدترین دور تھا(۱)۔ کتنی خطرناک بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے۔

۳:- صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو کافر ومرتد یا فاسق کہنے کا نتیجہ دو میں سے ایک ہوگا۔ یا تو یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالی کو ان باتوں کا علم نہیں تھا، اور وہ ان باتوں سے بے خبر تھا جو یہ لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں کہتے ہیں، یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالی نے ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی قرآن کی مختلف آیتوں میں جو تعریف کی ہے وہ ایک بے فائدہ اور لغو کام ہے، کیوں کہ اگر اللہ تعالی کو -تعالی عن قولهم- اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ کفر کریں گے، پھر اس نے ان کی تعریف کی، اور ان سے جنت کا وعدہ کیا، تو یہ جہل

(۱) الصارم المسلول: ۵۸۷

وناواقفیت ہے جو اللہ تعالی کی شان میں محال اور ناممکن ہے؛ اور اگر اللہ تعالی جانتا تھا کہ وہ عنقریب کفر کریں گے اور کافر ہو جائیں گے، تو اس کا ان کے لیے جنت کا وعدہ، اور ان سے رضا کا اعلان کرنا ایک بے فائدہ اور لغو کام ہے، اور یہ بھی اللہ تعالی کی شان سے بلند اور اس کے حق میں محال ہے(۱)۔

اور اس سے اللہ تعالی کی حکمت پر بھی طعنہ زنی لازم آئے گی کہ اللہ تعالی نے ان کو اپنے نبی ﷺ - کی صحبت ورفاقت کے لیے منتخب اور پسند فرمایا، چنانچہ انھوں نے آپ ﷺ کے ساتھ جہاد کیا، آپ ﷺ کی مدد ونصرت اور حمایت کی، اور آپ ﷺ نے ان کو اپنا رشتہ دار بنایا، اس طرح کہ اپنی دو بیٹیوں کو حضرت عثمان ذو النورین رضی اللہ عنہ کے عقد میں دے دیا، اور خود حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی بیٹیوں سے نکاح کیا؛ اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ایسے لوگوں کو اپنے نبی ﷺ کے مددگار یا خسر وداماد کی حیثیت سے کیسے منتخب کر لیا جن کے متعلق وہ جانتا تھا کہ آگے چل کر کافر ہو جائیں گے۔

۴:- رسول اللہ ﷺ تاریخ کے وہ عظیم الشان مربی و مصلح ہیں، جنھوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں تیئیس سال تک غیر معمولی اور بے نظیر کوشش کی، جس کے نتیجے میں اللہ کے فضل سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جو اپنے اخلاق وکردار، ایثار وقربانی، دنیا سے بے رغبتی اور تقوی وپرہیزگاری میں اپنی مثال آپ ہے۔

لیکن اس کے برخلاف ایک ایسی جماعت اور گروہ جو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف منسوب ہونے کا دعویدار ہے، اس مثالی معاشرہ کی ایک ایسی برعکس تصویر پیش کرتا ہے جو ان تمام کوششوں اور مساعئ جمیلہ پر پانی پھیر دیتی ہے جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت ورہنمائی کے سلسلے میں نبی ﷺ نے انجام دی تھیں، اور آپ کو ایسا ناکام ونامراد ثابت کرتا ہے، جس ناکامی کا منھ کسی غیر رسول یا غیر نبی مصلح یا مخلص وتجربہ کار مربی کو بھی نہیں دیکھنا پڑا(۲)۔

شیعوں کے فرقۂ امامیہ کا نظریہ- ان کی بعض روایتوں کے مطابق- یہ ہے کہ محمد ﷺ کی غیر معمولی اصلاحی کوششوں کا نتیجہ اور ثمرہ صرف تین یا چار اشخاص ہیں، جنھوں نے آپ ﷺ کی وفات

---

(۱) إتحاف ذوي النجابة لمحمد بن العربي التباني: ۷۵، مطبوعہ دار الأنصار

(۲) ان افترا پردازیوں اور گمراہ کن خیالات کے حامل بعض لوگوں نے کھل کر یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کامیاب نہیں ہوئے، اور یہ کہ اس کامیابی کا سہرا اس امام مہدی کے سر ہوگا جو ان کے امام غائب ہیں۔ دیکھئے: الرسول والرسالات للأشقر: ۲۱۲-۲۱۳

کے بعد اسلام کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور اس سے وابستہ رہے؛ ان کے علاوہ جو دوسرے لوگ تھے انھوں نے -العیاذ باللہ- آپ ﷺ کے وفات پاتے ہی اپنا تعلق اسلام سے منقطع کر لیا تھا، اور یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ نبی ﷺ کی صحبت وتربیت پوری طرح ناکام اور بے اثر تھی۔

اور یہ ایسا دعوی اور اعتقاد ہے جو انسانیت کی اصلاح سے مایوسی، تربیت اور تہذیب اخلاق کے سلسلہ میں اسلامی منہج اور طریقہ کی قدرت وصلاحیت پر عدم اطمینان اور محمد ﷺ کی نبوت میں شک وشبہہ کا موجب ہے؛ کیونکہ جو دین اپنے اولین داعی اور خود پیغمبر ﷺ کے زمانے میں دنیا کے لیے کامیاب، تعمیری اور عملی نمونوں کی معقول تعداد اور ایک مثالی معاشرہ نہ پیش کر سکا، تو پھر اس کے پیروکار عہد نبوت پر ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد یہ کام کیسے انجام دے سکتے ہیں؟!

اور اس دعوی کے مطابق جب مسلمان اپنے نبی ﷺ کے رفیق اعلی سے جا ملنے کے بعد راہ حق پر قائم اور اپنے نبی کے وفادار نہ رہ سکے، اور جس راہ راست پر نبی کریم ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو چھوڑا تھا، ان میں سے صرف چار اشخاص اس پر باقی رہے؛ تو پھر کس طرح ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ اس دین میں تزکیۂ نفس اور تعمیر اخلاق کی صلاحیت موجود ہے؟ اور وہ انسان کو بدبختی وگمراہی اور وحشت وبربریت سے نکال کر انسانیت کی بلندی تک پہنچا سکتا ہے؟ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر نبی کریم ﷺ اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہوتے تو ان کی تعلیمات میں تاثیر ہوتی، اور ایسے لوگ یقیناً پائے جاتے جو دل کی گہرائیوں سے ان پر ایمان لاتے، اور ایمان لانے والوں کی بھاری تعداد میں سیکڑوں ایسے افراد بھی موجود ہوتے جو ایمان پر ثابت قدم رہتے؛ لیکن جب تمام صحابۂ کرام ﷡ -سوائے چند افراد کے- ان کے دعوی کے مطابق منافق ومرتد تھے، تو پھر اسلام کہاں باقی رہا؟ اور رسول اللہ ﷺ سے کون مستفید ہوا؟ اور آپ رحمۃ للعالمین کیسے ہو سکتے ہیں[1]؟!

☆......☆......☆

---

(۱) صورتان متضادتان للشيخ أبي الحسن الندوي، بتصرف: ۱۳، ۵۳، ۵۴، ۵۸، ۵۹

مشاجرات صحابہ کی تفصیلات میں جانے سے ممانعت

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: 'جب میرے صحابہ کا ذکر کیا جائے تو رک جاؤ، اور جب ستاروں کا ذکر کیا جائے تو رک جاؤ، اور جب تقدیر کا ذکر کیا جائے تو رک جاؤ'(۱)۔

اسی لیے اہل سنت کا طریقہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی لغزشوں اور اُن سے سرزد ہونے والی چُوک کے تذکرہ وتتبُّع سے کنارہ کشی اختیار کی جائے، اور ان کے باہمی اختلافات کی تفصیلات میں جانے سے گریز کیا جائے۔

ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: 'چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کی لغزشوں کے تذکرہ سے پرہیز کرنا، ان کے محاسن کو پھیلانا، اور ان کے معاملات کی عمدہ توجیہ کرنا ان مسلمانوں کی علامت ہے جو بھلائی کے ساتھ ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی پیروی کرنے والے ہیں، جن کی تعریف اللہ تعالی نے اس آیت کریمہ میں کی ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ﴾(۲) (اور جو لوگ ان کے بعد آئے (اور وہ) یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو بخش دے اور ہمارے بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں)۔

نیز مذکورہ بالا حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: 'آپ ﷺ نے لوگوں کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے محاسن وفضائل کے تذکرے سے نہیں روکا ہے، بلکہ انھیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے آپس کے اختلاف اور ان باتوں کے تذکرے سے منع فرمایا ہے، جو غصے اور خفگی کے عالم میں ان سے صادر ہوئی ہیں'(۳)۔

پس معلوم ہوا کہ حدیث شریف میں جس چیز سے روکا گیا ہے، وہ ایک خاص قسم کی روک اور پابندی ہے، جس کا مقصد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان پائے جانے والے اختلافات اور ان کے درمیان ہونے والی جنگوں کی تفصیلات میں جانے اور ان کی ٹوہ میں پڑنے اور انھیں عوام میں پھیلانے، یا کسی جماعت کی حمایت اور دوسرے کی تنقیص وتنقید کے درپے ہونے سے روکنا اور منع کرنا ہے(۴)۔

---

(۱) المعجم الكبير: ۲/۷۸، حلية الأولياء: ۴/۱۰۸، السلسلة الصحيحة: ۱/۳۴

(۲) سورة الحشر: ۱۰، دیکھئے الإمامة: ۳۷۳ — (۳) الإمامة: ۳۴۷

(۴) منهج كتابة التاريخ الإسلامي لمحمد بن صامل العلياني السلمي: ۲۲۷-۲۲۸

اس کے بجائے ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان کے لیے مغفرت کی دعا اور ان سے محبت کریں، اور ان کے محاسن اور فضائل وکمالات کو پھیلائیں اور عام کریں۔ لیکن اگر کوئی بدعتی اور گمراہ شخص اپنے باطل نظریات کے ذریعہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر طعنہ زنی اور ان کی تنقیص وتوہین کرے، تو پھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا دفاع کرنا اور ان امور کا علم حاصل کرنا، اور ان کو عدل وانصاف کے ساتھ اس طرح بیان کرنا جس سے اس کے دعوی اور دلیل کا ردو اِبطال ہو سکے ضروری اور ناگزیر ہوگا[1]۔

اس منہج اور طریقۂ کار کی ہمیں اس دور میں شدید ضرورت ہے، جہاں امت مسلمہ اپنے مدارس اور یونیورسٹیوں میں اس نصاب تعلیم کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا ہے، جس کو تشکیل دینے والے موضوعیت (حقیقت پسندی) اور علمیت کے نام پر مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں اپنے باطل نظریات کے ساتھ اور ان آداب سے بہرہ مند ہوئے بغیر جن کی تعلیم ہم کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، دخل اندازی کرتے ہیں۔

اسی طرح یہ بات بھی انتہائی قابل افسوس ہے کہ یہ متعدی مرض بعض اسلامی مصنفین کو بھی لگ گیا ہے، یہاں تک کہ بعض مصنفین ان رطب ویابس روایتوں کو اکٹھا کرتے ہیں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان برپا ہونے والے فتنوں سے تعلق رکھتی ہیں، پھر انھیں روایتوں پر اپنے فیصلوں کی بنیاد رکھتے ہیں، اور اس کے لیے ائمۂ اعلام کے اقوال اور ان کی تحقیقات سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اسی لیے میں بعض ایسی بنیادی باتوں اور رہنما اصول کی طرف اشارہ کر دینا چاہتا ہوں، جن کا علم حاصل کرنا ہر اس محقق کے لیے ضروری اور ناگزیر ہے جس کو ضرورت کے وقت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مشاجرات کی تحقیق درپیش ہو۔

---

(۱) منهاج السنة: ۲۵۴/۲، تحقيق: د. رشاد سالم

اعیان الحجاج سے ماخوذ

مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

امیر جنفل ترکی امیر الحاج یہ ایک ترکی امیر تھا، جس نے صرف سولہ ترکیوں کو ساتھ لے کر قبیلۂ بنوخفاجہ کے بدوؤں کو جو حجاج کے قتل وغارت، اور خبث وشرارت میں سب قبائل سے آگے تھے، زیر کیا، اور ان کی جمعیت کو درہم برہم کر دیا، اس کے بعد اس نے زاہر میں جو راستہ کی ایک منزل ہے قیام اختیار کر لیا (ج ۱۱ص ۱۱۳، ابن کثیر) ۴۶۸ھ سے ۴۷۸ھ تک اسی امیر کی قیادت وحمایت میں عراق کا قافلۂ حجاج حج کی سعادت حاصل کرتا رہا، ۴۷۸ھ میں اس کا آخری حج تھا اس سال اس نے آتے جاتے دو دفعہ آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا تو اس نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں میرا یہ آخری حج ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس امیر نے بدوؤں کے مقابلہ میں اپنی شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے اور کئی موقعوں پر ان کو ایسی شکست دی کہ سارے اعراب مرعوب ہو گئے اور ان کی جمعیت منتشر ہو گئی، ان کارناموں کے ساتھ وہ بڑا پابند نماز تھا، اور باجماعت پڑھتا تھا، روزانہ قرآن پاک کا ایک ختم کرتا تھا، حج کے راستہ میں حوضوں اور کنوؤں کی مرمت اور حجاج کے فائدہ کے دوسرے کام بھی اس نے بہت کیے، کوفہ میں مزار یونس کے پاس حنفیوں کے لیے ایک مدرسہ بھی اس نے قائم کیا تھا، اور بغداد کے مغربی جانب لبِ دریائے دجلہ ایک مسجد بھی تعمیر کرائی، ۴۷۹ھ میں جب اس کی وفات ہوئی اور نظام الملک وزیر کو اس اطلاع ملی تو اس نے کہا جنفل کی موت ہزار آدمیوں کی موت ہے (ابن کثیر) ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ وہ بارہ سال امیر الحج رہا، ابن الجوزی نے اس کا نام ختلغ (قتلغ) بن کشتکین لکھا ہے۔

(ابن کثیر ج ۱۲ص ۱۳۱، ۴۷۵ھ تاج ۱۲ص ۱۴۳)

امیر خمارتکین حسناتی امیر الحاج اس امیر کو ۴۷۹ھ میں قافلہ حجاج کی امارت وقیادت تفویض ہوئی اور اسی سال مصر کی فاطمی حکومت (جو باطنیوں کی حکومت تھی) کا خطبہ حرمین میں موقوف ہوا، اور کعبہ کے دروازہ پر فاطمی حاکم کے نام کی جو تختیاں لگی ہوئی تھیں ان کو نکلوا کر عباسی خلیفہ کے نام کی تختیاں

لگوائی گئیں، ۴۷۹ھ سے لے کر ۴۹۷ھ تک اکثر و بیشتر یہی امیر اس خدمت پر مامور ہوتا رہا ہے، ۴۸۵ھ میں قبیلۂ بنوخفاجہ نے قافلہ لوٹنا چاہا تو جو فوج قافلہ کی حفاظت کے علاوہ حج کے ارادہ سے اس امیر کے ساتھ ہوتی تھی اس نے بدوؤں کا جم کر مقابلہ کیا اور ان کو شکست دے دی، اس امیر کے مزید حالات اور اس کا ـــھ وفات دریافت نہ ہوسکا۔

اس اٹھارہ برس کے عرصہ میں ایک بار حمید عمری اور ایک بار امیر تونتاش شافعی بھی امیر حج مقرر ہوئے ہیں۔

امیر الحاج قطز بن عبداللہ خادم | امیر خمارتکین کے بعد ۵۰۰ھ میں محمد بن ملک شاہ کی طرف سے امیر ترکمان امیر حج مقرر ہوا اور ۵۰۲ھ و ۵۰۳ھ و ۵۰۴ھ میں امیر قیماز نے یہ خدمت انجام دی، اور ۵۰۵ھ میں اس اہم خدمت کے لیے امیر الجیوش قطز خادم نامزد ہوا، اور اس وقت سے لے کر ۵۴۴ھ تک چند سالوں کے استثنا کے ساتھ برابر یہ خدمت انجام دیتا رہا، جس سالوں کا ہم نے استثنا کیا ہے ان میں سے ایک سال جمال الدولہ اقبال مسترشدی نے (۵۱۸ھ میں) اور ایک سال برنقش نے (۵۲۳ھ میں) اور ایک سال ارجواں نے (۵۴۰ھ میں) امارت حج کے فرائض انجام دیے، امیر قطز نے حدیثیں بھی سنی تھیں، ابوالحسی زاغونی اس کے مؤدب تھے، اس نے ستائیس حج کیے تھے، بیس سے زائد حجوں میں وہ امیر الحاج تھا، ابن الجوزی محدث نے ۵۴۱ھ میں اس کے زیر قیادت حج کیا تھا اور اس سفر میں اس سے سماع حدیث کا ارادہ بھی کیا مگر راستہ کے انتظام کے سلسلہ میں اس کی کوئی ایسی بات انھوں نے دیکھی جو ان کے خیال میں ظلم تھی اس لیے سماع کا ارادہ ترک کر دیا ۵۴۴ھ میں جب وہ حجاج کے قافلہ کو لے کر چلا تو بیمار تھا کوفہ پہنچ کر اس کا مرض ترقی کر گیا اس لیے اپنے خادم قیماز کو یہ خدمت سپرد کر کے وہ بغداد واپس آگیا اور ۲۱/ ذیقعدہ ۵۴۴ھ کو انتقال کر گیا، امیر مکہ اور بدوؤں پر اس کا بڑا رعب تھا چنانچہ اس سال جب اس کی جگہ بدوؤں نے قیماز کو دیکھا تو اس کو خاطر میں نہیں لائے اور قافلہ کو لوٹ لیا۔ (ابن جوزی)

ابن کثیر نے لکھا ہے، و کان الحاج معه الخ ص ۲۲۸ ج ۱۲۔

امیر الحاج قیماز ارجوانی | ۵۴۵ھ سے ۵۵۴ھ تک اس امیر نے حجاج کی قیادت کی اور اس خدمت کے طفیل میں اس کو حج کی سعادت حاصل ہوتی رہی یہ بہت نیک امیر تھا، شعبان ۵۵۵ھ میں گیند کھیل رہا تھا کہ گھوڑے سے گر گیا اور گرتے ہی اس کی جان نکل گئی، اس کی وفات کا لوگوں کو بہت رنج ہوا، اور

نماز جنازہ میں لاتعداد مخلوق شریک ہوئی (ابن کثیر وابن جوزی)

امیر برغش کبیر کوفہ کا امیر تھا، ۵۵۵ھ سے لے کر ۵۶۱ھ تک امیر الحاج کے عہدہ پر رہا، اور حج کی سعادت اس کو حاصل ہوتی رہی، فوج بھی اس کے ماتحت تھی، ۵۶۲ھ میں گھوڑے سے گر کر قضا کر گیا۔ (ابن کثیر)

اسدالدین شیر کوہ سلطان نورالدین شہید کے معتمد امراء میں سب سے بڑا امیر اور شجاعت و بہادری وحسن تدبیر میں فرد تھا، فرنگیوں کے مقابلہ میں ان کے مجاہدانہ کارنامے تاریخ کے صفحات کی زینت ہیں دمشق اور اسکندریہ کو فاطمیوں کے ہاتھ سے اسی نے نکالا، اور ان معرکوں میں اس نے اپنی بہادری اور جنگی صلاحیتوں کے وہ جوہر دکھائے جس نے مخالفین کے حوصلے پست کر دیئے، اور مسلمانوں کے دل سے دعائیں نکلیں، ابن کثیر نے ان معرکوں کی طرف اشارہ کر کے لکھا ہے **بل اللّٰہ بالرحمۃ وجعل الجنۃ مثواہ،** (اللہ آب رحمت سے اس کی خاک کو سیراب کرے اور جنت کو اس کا مسکن بنائے) شیر کوہ نے ۵۵۵ھ میں حج کی سعادت حاصل کی اور اہل حرمین پر انعام واکرام کی خوب بارش کی۔ (ابن جوزی ج۱۰ص۱۹۶)

شیر کوہ کی وفات ۵۶۴ھ میں ہوئی، اور وہ مصر کے دارالامارہ میں مدفون ہوئے ۵۶۸ھ میں ان کے بھائی نجم الدین ایوب سلطان صلاح الدین ایوبی کے والد کی وفات ہوئی تو وہ بھی وہیں مدفون ہوئے مگر تقریباً دوسال کے بعد ۵۸۰ھ میں ان دونوں بھائیوں کو وزیر جمال الدین موصلی کی اس رباط میں جو انھوں نے روضۂ مقدسہ نبوی کے متصل بنوائی تھی لے جا کر دفن کیا گیا، جہاں سے روضۂ نبوی صرف سترہ ہاتھ کے فاصلہ پر ہے۔ (ابن کثیر ج۱۲ص۲۷۲)

علی کوچک اس کا لقب نورالدین (۱) اور باپ کا سبکتگین تھا، موصل کا حاکم تھا مگر بڑھاپے میں ثقل سماعت اور بینائی کمزور ہوجانے کی وجہ سے اس نے موصل کی حکومت سلطان نورالدین شہید کے بھائی قطب الدین مودود کے حوالہ کردی، علی کوچک بڑا عادل، نیک سیرت، امانت دار اور بدعہدی سے پاک بادشاہ تھا، لوگوں کی لغزشوں کو عموماً معاف کردیا کرتا تھا، نہایت مبارک قدم تھا، جس لشکر میں وہ موجود رہا اس کو شکست نہیں ہوئی، پہلے بس ایک بڑا عیب اس میں یہ تھا کہ وہ تنگ دل اور بخیل تھا۔ چنانچہ شیر کوہ کے

---

(۱) شذرات الذہب میں زین الدین لقب اور اربل کا حاکم لکھا ہے۔

ساتھ ۵۵۵ھ میں اس نے بھی حج کیا تھا، شیر کوہ کی فیاضی کی مدح سرائی کے بعد مورخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ **ولم یفعل کوچک شیئاً یذکر مع کثرۃ مالہ** یعنی اس حج میں کوچک نے نہایت دولتمندی کے باوجود کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا۔ (ج ۱۰ص ۱۹۶) مگر بعد میں یہ عیب بھی زائل ہوگیا، آخر عمر میں اس نے کئی کئی مدرسے رباطیں اور پل بنوائے، اور اپنی ساری دولت صدقات وخیرات میں لٹادی، مرنے کے بعد اس نے کچھ نہیں چھوڑا، ۵۶۳ھ میں اس کی وفات ہوئی۔

(حاشیہ ابن جوزی ج ۱۰ص ۲۲۳)

جمال موصلی | محمد بن علی نام ابوجعفر کنیت تھی، حاکم موصل قطب الدین مودود بن زنگی اور اس کے باپ اور بھائی کا وزیر تھا، جود واحسان اور کثرت خیرات وصدقات، اس کا ممتاز وصف تھا، اسی لیے جواد اصفہانی کے لقب سے اس کی شہرت ہے۔ مکہ ومدینہ میں اس کی بڑی بڑی یادگاریں ہیں اس نے حرم کے دروازے مستحکم کروائے، ان کی چوکھٹیں اونچی کرائیں، عرفات میں ایک چشمہ کا پانی نہر کے ذریعہ پہنچایا مسجد خیف کی ازسرِ نو تعمیر کرائی، مدینہ منورہ کی شہر پناہ بنوائی، اس کے علاوہ بہت سی رباطیں اور موصل میں ایک پل بنوایا، روزانہ اپنے دروازہ پر سو دینار خیرات کرتا تھا، مسلمان قیدیوں کو چھڑانے میں سالانہ دس ہزار دینار صرف کرتا تھا، مختلف شہروں کے فقہاء اور فقراء کے پاس برابر امدادی رقوم بھجواتا تھا، اسدالدین شیر کوہ سے اس کی بڑی دوستی تھی اور آپس میں معاہدہ تھا کہ جو پہلے مرے اس کو دوسرا مدینہ منورہ لے جا کر دفن کرے، اتفاق سے پہلے جمال موصلی مرے اور شیر کوہ نے معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے ان کی نعش مدینہ بھجوائی، موصل سے مدینہ تک کاندھوں پر اٹھا کر لوگ ان کی نعش لے گئے اور راستہ میں جس جس آبادی سے گزر ہوا سب نے ان کی تعریف اور ان کی موت پر اظہار افسوس کیا اور موصل کے علاوہ تکریت، بغداد، حلہ، کوفہ، فید اور مکہ معظّمہ میں ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی، مکہ میں ان کی نعش کو کعبہ کا طواف کرانے کے بعد مدینہ منورہ لے جا کر مسجد نبوی کے شرقی جانب میں جو رباط جمال موصل نے بنوائی تھی اس میں ان کو سپردِ خاک کیا گیا۔ ابن الساعی مورخ کا بیان ہے کہ روضۂ پاک نبوی اور ان کی قبر کے درمیان صرف پندرہ ہاتھ کا فاصلہ ہے، حلہ میں نماز جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد ایک حلی شاعر نے ایک ٹیلہ پر چڑھ کر ان کی مدح میں یہ دو دردانگیز اور سچے شعر پڑھے

سریٰ نعشہ فوق الرقاب وطالما — سریٰ جودہ فوق الرکاب ونائلہ

آج اس کی نعش لوگوں کے کندھوں پر سفر کر رہی ہے اور اب سے پہلے اس کی بخشش سواریوں پر سفر کرتی رہی ہے

یمر علی الوادی فتثنی رماله علیه وبالنادی فتثنی ارامله

وہ وادی سے گزرتی ہے تو وادی کے ذرات اس کی مدح خوانی کرتے ہیں اور آبادی سے گزرتی ہے تو بیوائیں اس کی ثناخوانی کرتی ہیں

جمال موصلی کی وفات ۵۵۹ھ میں ہوئی۔ (ابن جوزی، ابن کثیر)

امیر شمس الدین محمد بن عبدالملک بن مقدم سلطان صلاح الدین ایوبی کے نائب اور دولت ایوبیہ کے وزراء میں تھے، سلطان نے ۵۸۳ھ میں جب بیت المقدس کو فتح کیا، تو اس فتح کی خوشی میں مسلمانوں کی ایک جماعت حج کے زمانہ میں بیت المقدس سے حج کا احرام باندھ کر گئی، اس سال سلطان کی طرف سے امیر شمس الدین امیر الحاج تھے، اور خلیفہ بغداد کی جانب سے امیر طاشتکین امیر الحاج تھا، نویں تاریخ کو جب سارے عالم کے حجاج میدانِ عرفات میں اکٹھا ہوئے تو شامی مسلمانوں نے شامی جھنڈے لہرائے۔ اور نوبت بجوائی اور اس عنوان سے سلطان صلاح الدین کی عظمت وجلال کا مظاہرہ کیا، یہ بات امیر طاشتکین کو ناگوار ہوئی اور اس نے روکنا چاہا مگر شنوائی نہیں ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طرف سے تلواریں نکل آئیں، جنگ شروع ہوگئی، اور بہت المناک واقعات پیش آئے، اس لڑائی میں امیر شمس الدین بھی زخمی ہوئے، اور دوسرے دن منیٰ پہنچ کر ان کا انتقال ہوگیا۔ خلیفہ بغداد کو اس کی خبر پہنچی تو طاشتکین کو اس کی حرکت پر سخت ملامت کی، اور اس خوف سے کہ کہیں سلطان صلاح الدین خلافت بغداد سے اس کا انتقام نہ لے، طاشتکین کو اس کے منصب سے معزول کر دیا گیا۔ (ابن کثیر)

امیر حسام الدین محمد بن عمر بن لاچین اور سِتّ الشام بنت ایوب سِتّ الشام، سلطان صلاح الدین ایوبی کی ہمشیرہ تھیں اور امیر حسام الدین ان کے بیٹے سلطان صلاح الدین کے بھانجے تھے، سلطان کے مجاہدانہ کارناموں اور ان کی عظیم الشان فتوحات میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، سلطان کی طرف سے نابلس کے حاکم تھے، انھوں نے اپنی والدہ کو ساتھ لے کر ۵۸۲ھ میں حج کیا تھا، محرم ۵۸۳ھ میں جب سلطان دمشق سے عکّا کو فتح کرنے کے ارادہ سے نکلے تو چونکہ یہ لوگ ابھی حج سے

واپس نہیں آئے تھے، سلطان کو ان کی جانب سے تشویش تھی، اس لیے مقام بصری میں فوج کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کیا، جب آخر محرم میں یہ لوگ آ گئے اور سلطان کو اطمینان ہوا تو کرک کی طرف فوج کو کوچ کا حکم دیا (مرآۃ ج ۸ ص ۳۹۲)

امیر کی وفات ۵۸۷ھ میں ہوئی (ابن کثیر) **ستّ الشام** صرف صلاح الدین کی بہن نہیں تھیں بلکہ متعدد بادشاہوں کی بہن، اور کئی ایک کی ماں اور کئی ایک پھوپھی تھیں، ۳۵ بادشاہ ان کے محرم (بیٹے بھائی اور بھتیجے) تھے، ان کے اوقاف میں دو مدرسے شامیہ جوانیہ اور شامیہ برانیہ ہیں، ابن کثیر نے الست الجلیلة کہہ کر ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ نہایت کثرت سے خیرات کرتی تھیں اور فقراء و محتاجین کے ساتھ بڑا احسان کرتی تھیں، ہر سال ہزاروں دینار کے شربت اور دوائیں اور جڑی بوٹیاں فراہم کر کے بلا امتیاز تقسیم کرتی تھیں ۶۱۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

نصر اللہ بن الفائض وزیر سلطان صلاح الدین انھوں نے اس وقت جب صلاح الدین ایوبی صاحب تخت و تاج نہیں تھے، ان کی خدمت اور مالی امداد و اعانت کی تھی، سلطان نے بادشاہت کے بعد ان کی خدمتوں کی قدر دانی کی اور ان کو اپنا وزیر مقرر کر لیا، نصر اللہ بہت قابل وثوق، دیانت دار، امین اور بہادر تھے، انھوں نے ۵۷۴ھ میں حج کیا اور اس سال حکومت شام کی طرف سے گویا وہی امیر الحاج تھے ۵۸۷ھ میں ان کی بھی وفات ہوئی (مرآۃ)

امیر طاشکین مستنجدی مجیر الدین لقب تھا، بغداد کے خلیفہ عباسی کی طرف سے امیر الحاج کے عہدہ پر تھے ۲۶ برس تک انھوں نے یہ خدمت انجام دی اور اس خدمت کے طفیل میں حج کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوتے رہے، ابن کثیر کا بیان ہے کان فی غایة حسن السیرة (یعنی انتہا درجہ کے نیک سیرت تھے) آخر میں ان کے حاسدوں نے ان پر یہ تہمت لگائی کہ سلطان صلاح الدین ایوبی سے ان کی خط و کتابت ہے اور سلطان کو بغداد کی حکومت پر قبضہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں، حالانکہ اس کی کوئی اصلیت نہیں تھی مگر خلیفہ کا عتاب ان پر نازل ہوا، اپنے عہدہ سے الگ کر دیئے گئے، اور جرمانہ اہانت اور قید و بند مزید براں، ۵۸۸ھ میں یہ معزول کیے گئے، پھر جب ان کی براءت ثابت ہو گئی تو خلیفہ نے دوبارہ ان کو امیر الحج مقرر کیا، اور خوزستان کا علاقہ ان کی جاگیر میں عطا کیا، ابوشامہ نے ان کو مستنجدی کے بجائے مقتفوی لکھا ہے اور لکھا ہے کہ حجاز میں یہ ایک بادشاہ کی طرح رہتے تھے۔ بہت

بہادر اور نہایت فیاض تھے، ۶۰۲ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

شاہ حلب الملک الظافر خضر نام تھا اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے صلبی لڑکے تھے، ۶۱۰ھ میں حج کے ارادہ سے دمشق آئے تو وہاں ان کا نہایت شاندار استقبال ہوا، اور ان کے چچا زاد بھائی معظم نے ان کا بہت اکرام کیا اس کے بعد حجاز روانہ ہوئے، جب مکہ پہنچنے میں چند منزلیں باقی رہ گئی تھیں تو کامل شاہِ مصر کے آدمیوں نے یہ کہہ کر ان کو مکہ جانے سے روک دیا کہ آپ یمن پر قبضہ کرنے کے ارادہ سے آئے ہیں انھوں نے ہر چند صفائی دی بلکہ یہاں تک کہا کہ تم مجھے مقید کر لو اور اپنی حراست میں حج کے مناسک ادا کر لینے دو مگر وہ نہیں مانے، اور کہا ہم کو ایسا کوئی حکم نہیں ملا ہے ہم کو تو بس یہ حکم ہے کہ ان کو جانے سے روکو اور واپس لاؤ، شاہ حلب کے آدمیوں نے مقابلہ کرنا چاہا مگر شاہ نے اس خیال سے کہ ایک فتنہ برپا ہو جائے گا، ان کو اس سے باز رکھا اور احرام کھول کر شام واپس چلے آئے، اہلِ قافلہ نہایت رنجیدہ ہوئے اور شاہ کو رخصت کرنے کے وقت لوگ زار و قطار رو رہے تھے، ابن کثیر نے اس واقعہ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ ان کے اس عمل کو قبول فرمائے۔

الملک المعظم عیسی بادشاہ دمشق وشام اپنے والد الملک العادل کی وفات کے بعد ۶۱۰ھ میں دمشق میں تخت وتاج کے مالک ہوئے، حافظ قرآن اور حنفی مذہب کے صاحب بصیرت فقیہ تھے، کئی جلدوں میں امام محمد کی جامع کبیر کی شرح لکھی تھی اس میں دوسرے علماء کی امداد واعانت بھی شامل تھی، زمخشری کی مفصل زبانی یاد تھی، مدرسہ نوریہ کے مدرس امام حصیری کے پاس فقہ حنفی کی تعلیم پائی تھی، اور مشہور ومعروف لغوی ومحدث تاج الدین کندی کی خدمت میں فن لغت اور نحو کی تحصیل کی تھی، انھوں نے بعض علمائے فن کو اس کام پر مامور کیا تھا کہ لغت کی ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں جوہری کی صحاح اور ابن درید کی جمہرہ، اور ازہری کی تہذیب کو یکجا کر دیا جائے، اسی طرح کسی کو اس کا حکم بھی دیا تھا کہ مسند احمد کو ابواب پر مرتب کریں، مختصر یہ کہ بادشاہوں کے طبقہ میں اس علمی شغف کی مثال بہت کم ملے گی جو ملک معظم کو حاصل تھا، ابن کثیر کا بیان ہے کہ ان کو علماء سے بڑی محبت تھی اور ان کا بہت احترام کرتے تھے، وہ ہمیشہ اس کی بھی کوشش کرتے تھے کہ نیک راستہ پر چلیں انھوں نے وصیت کی تھی کہ مجھ کو (سنت کے مطابق) سفید کپڑوں کا کفن دیا جائے۔ اور میری قبر بصورتِ لحد بنائی جائے، اور مجھ کو صحرا میں دفن کیا جائے اور اس پر کوئی عمارت تعمیر نہ کی جائے۔

دمیاط کی لڑائی میں انھوں نے عیسائیوں کا بہت بے جگری سے مقابلہ کیا تھا اور خوب خوب

دادِ شجاعت دی تھی، چونکہ خالص اسلام کی سربلندی کی نیت سے اس معرکہ میں انھوں نے اپنی جان کی بازی لگائی تھی اس لیے کہتے تھے کہ اپنے اس کام کو میں نے اللہ کے پاس ذخیرہ بنایا ہے اور امیدوار ہوں کہ اس کی بدولت وہ مجھ پر رحم کرے گا۔

وہ ہر جمعہ کو نماز سے بہت پہلے نکلتے تھے اور اپنے والد کے مزار کے پاس تھوڑی دیر بیٹھتے تھے اس کے بعد اپنے چچا صلاح الدین ایوبی کے مزار پر جاتے تھے اور انھیں کے مزار کے پاس جو مسجد ہے اس میں جمعہ کی نماز پڑھتے تھے۔

ان کے مزاج میں شاہانہ کروفر قطعاً نہ تھا، بسا اوقات اکیلے سوار ہو کر نکل پڑتے تھے جب خدم وحشم کو اطلاع ہوتی تو وہ بھاگ کر ان سے جا ملتے تھے، جو شخص زمخشری کی مفصل زبانی یاد کرڈالے اس کے لیے سو دینار انعام کا اعلان ان کی طرف سے تھا اس لیے بہت سے لوگوں نے مفصل کو زبانی یاد کرڈالا تھا۔

۶۱۱ھ میں جب ان کے والد الملک العادل بقید حیات اور سلطان شام تھے ملک معظم عیسیٰ بہت سے امرائے دولت اور دوسرے بکثرت آدمیوں کی رفاقت میں کرک سے سانڈنیوں پر سوار ہو کر حج کے لیے تبوک والعلا کے راستہ سے چلے اور اسی سال اس راستہ کا مشہور تالاب جو ان کی نسبت سے برکۃ المعظم کہلاتا ہے انھوں نے تیار کرایا، اس راستہ سے حاجیوں کو پہلے مدینہ منورہ ملتا ہے، وہ مدینہ آئے تو مدینہ کے حاکم نے جس کا نام سالم تھا ان کا پرتپاک استقبال کیا اور کنجیاں ان کے حوالہ کردیں اور پوری پوری خدمت بجالایا۔ لیکن جب مکہ پہنچے تو قتادہ حاکمِ مکہ ان کو خاطر میں بھی نہیں لایا، اسی لیے جب وہ حج وادائے مناسک سے فارغ ہوئے اور جو مال ودولت یہاں کے مجاورین میں بانٹنے کے لیے لائے تھے ان کو تقسیم کرکے مدینہ کے راستہ سے شام واپس ہونے لگے تو سالم حاکم مدینہ کو اپنے ساتھ لے لیا اور جب اپنے والد ملک عادل سے مقام راس الماء میں ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے قتادہ حاکمِ مکہ کی شکایت کی، عادل کو سخت ناگواری ہوئی اور اس نے سالم حاکمِ مدینہ کے زیر کمان ایک فوج مکہ روانہ کی اور حکم دیا کہ قتادہ کو مکہ سے نکال دو لیکن اس فوج کے پہنچنے اور مکہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی قتادہ پہاڑوں اور جنگلوں میں بھاگ گیا۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ملک معظم نے اس حج میں قران کا احرام باندھا تھا، اور بقول ابن کثیر کے اس نے حج کے ساتھ حجاز کے راستہ میں بہت سی اچھی یادگاریں قائم کیں، جو حجاج کے لیے موجب راحت وآسائش ہوئیں، ملک معظم کی وفات ۶۲۴ھ میں ہوئی۔

شاہ یمن الملک المسعو دافسیس | الملک الکامل کا لڑکا اور یمن کا بادشاہ تھا، اس نے ۶۱۹ھ میں حج کیا مگر افسوس ہے کہ اس کا حج نیاز مندانہ نہیں تھا، وہاں پہنچ کر بھی حکومت کا نشہ نہیں اترا تھا، اس لیے اس کا عادات واطوار کسی کو پسند نہیں آئے، پھر ۶۲۰ھ میں اس نے حاکم مکہ حسن بن قتادہ کے خلاف فوج کشی کی، اور عین صفا ومروہ کے بیچ میں جنگ ہوئی، لڑائی میں حاکمِ مکہ کو شکست ہوئی اور وہ پہاڑوں میں بھاگ گیا، اس وقت مکہ میں زیدیوں کی حکومت تھی، اقسیس کے ہاتھ سے اس حکومت کا خاتمہ ہوا اور اب وہ خود یمن کے ساتھ مکہ کا بھی حاکم ہو گیا، اس کی حکومت کا بڑا رعب تھا اور رعیت کے دلوں میں اس کا احترام تھا اس لیے اس کے دور میں دونوں ملکوں میں نہایت امن تھا، راستے بے خطر تھے اور حجاج پورے اطمینان سے آتے جاتے تھے، یہی بات اس کی قابلِ تعریف تھی، ۶۲۶ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ (ابن کثیر ج ۱۳ص ۹۸-۹۹-۱۲۴)

المعتمد ابراہیم حاکمِ دمشق | الملک المعظم عیسی کے عہدِ حکومت میں دمشق کا حاکم تھا، چالیس برس تک وہ اس منصب پر رہا ابن کثیر کا بیان ہے کہ وہ نہایت پاکباز، نیک سیرت، فیاض اور بہترین حاکم تھا، وہ عزت دار لوگوں کی کبھی بے عزتی کے درپے نہیں ہوتا تھا اس کے زمانہ میں عدل وانصاف کے عجیب عجیب واقعات پیش آئے اور مجرموں کا کھوج لگانے میں اس کی ذہانت کے بڑے نادر نمونے دیکھنے میں آئے، آخر آخر کسی شکایت کی بنا پر وہ اپنے عہدہ سے ہٹا دیا گیا، مگر منادی کرانے کے بعد ایک شخص بھی یہ کہنے والا نہ ملا کہ اس نے ہم سے رائی کے دانہ کے برابر رشوت لی ہے (۱۳ ص ۱۱۵)

وہ ۶۱۷ھ میں معزول ہوا اور اسی سال اس نے حج کیا، حجاج کا امیر بھی وہی تھا اور اس کی وجہ سے حاجیوں کو بڑا فائدہ پہنچا، قصہ یہ ہوا کہ اس سال خلیفۂ بغداد کی جانب سے اقباش ناصری جو دربارِ خلافت کا بہت بڑا امیر اور خلیفہ کے خاص آدمیوں میں تھا وہ عراقی حجاج کے امیر کی حیثیت سے مکہ آیا تھا اور خلیفہ نے اسی کے ہاتھ حسن بن قتادہ کے نام حکومت مکہ کا فرمان اور خلعت بھی بھیجی تھی۔ قتادہ کا سب سے بڑا لڑکا راجح تھا اس نے مخالفت کی اور کہا میرے سوا کوئی دوسرا حاکمِ مکہ نہیں ہوسکتا، اسی بات پر دونوں بھائیوں میں لڑائی ہوگئی اور اسی میں غلطی سے اقباش ناصری کی جان بھی چلی گئی، چونکہ وہی امیر الحج تھا اور وہ قتل ہو گیا تو غلاموں کا ایک سرکش طبقہ جو مکہ میں آباد تھا اس نے موقع پا کر حاجیوں کو

لوٹنے کا تہیہ کرلیا اس موقع پر انھیں معتمد نے بہادری دکھائی اوران کو اس حرکت سے باز رکھا۔

چونکہ یہاں مکہ کے حاکم قتادہ کا نام آگیا ہے اس لیے اتنا بتا دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا کہ وہ زیدی مذہب کا پابند لانبے قد کا بوڑھا آدمی تھا اور بڑا بارعب تھا، کسی خلیفہ یا بادشاہ سے نہیں ڈرتا تھا نہ کسی کے آگے جھکنے کا نام لیتا تھا وہ اپنے کو سب سے زیادہ حکومت بلکہ خلافت کا حقدار سمجھتا تھا، اسی وجہ سے یاد ہوگا کہ ملک معظم جب حج کو آئے تو وہ ان کو بھی خاطر میں نہ لایا وہ پہلے تو انصاف شعار بادشاہ تھا مگر بعد میں اس کے برعکس بڑا ظالم ہوگیا نئے نئے ٹیکس لگائے اور کئی بار حاجیوں کو لوٹا، قتادہ ۶۱۷ھ میں خود اپنے بیٹے حسن کے ہاتھ سے مارا گیا، مگر اپنے باپ کو مار کر حسن کو بھی چین نصیب نہ ہوا صرف دو سال کے بعد اس کے ہاتھ سے بھی مکہ کی حکومت نکل گئی اور وہ پہاڑوں میں جا کر لاپتہ ہوگیا یا قتل ہوگیا۔ (ابن کثیر ۱۳ص ۱۹۲)

(جاری ہے)

صفحہ ۸۰ کا بقیہ

معلوم ہوا ہے کہ اس کا عربی اڈیشن بھی ''**الثورة الایرانیه فی میزان الاسلام**'' کے نام سے مصر میں شائع ہوگیا ہے؛ لیکن اس کا کوئی نسخہ ابھی تک میرے پاس نہیں آیا ہے۔ یہ کتاب حضرت نے ملاحظہ نہ فرمائی ہو تو اس کی فہرست مضامین پر ہی نظر ڈال لی جائے۔ احتیاطاً اس کا نسخہ ڈاک سے روانہ کررہا ہوں۔

برادران عزیز و مکرم مولانا رشید احمد صاحب و مولوی سعید احمد صاحب کو سلام مسنون۔

دعاؤں کا محتاج و طالب ہوں، والسلام۔

محمد منظور نعمانی

۱۳/اگست ۸۶ء

قیاس واجتہاد کے باب میں

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث کی حجیت

تحریر: علامہ زاہد کوثری رحمہ اللہ تعالی ترجمہ: عبدالرحمٰن قاسمی انصاری

ان دنوں قیاس واجتہاد کے بارے میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث کے متعلق بہ کثرت سوال ہوتا رہتا ہے، لہذا اس کی نسبت چند باتیں عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ابوداؤد، ترمذی اور دارمی نے الفاظ کے فرق کے ساتھ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہ جب آنحضرت ﷺ نے ان کو یمن روانہ کیا تو دریافت فرمایا کہ ''تم فیصلہ کس طرح کرو گے؟'' عرض کیا کہ ''اللہ کی کتاب (قرآن کریم) کے مطابق فیصلہ کروں گا، آپؐ نے فرمایا کہ ''اگر (اس کا حل) کتاب اللہ میں نہ ہو تو؟'' معاذؓ نے عرض کیا کہ ''اللہ کے رسول کی سنت کے مطابق کروں گا''۔ آنحضرت ﷺ نے پھر پوچھا کہ ''اگر سنت رسول میں بھی نہ ہو تو؟'' حضرت معاذؓ نے کہا کہ ''جہاں تک ہو سکے گا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے پیغمبر کے فرستادہ کو اس کی توفیق دی، جس کو اس کا پیغمبر پسند کرتا ہے''۔

یہ حدیث منجملہ ان دلائل کے ہے کہ کسی مسئلہ کے حکم میں کتاب وسنت کی کوئی نص نہ ہونے کے وقت قیاس پر عمل کیا جاتا ہے (یعنی ان دلائل میں سے ہے جن سے قیاس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے)، اور اسی پر امت کا عمل درآمد رہا ہے، یہاں تک کہ نظّام نے قیاس کے انکار کی بدعت ایجاد کی، اور پھر اس انکار میں کچھ سرپھرے بدعتیوں نے نظّام کی پیروی کی۔

اس حدیث کو حضرت معاذؓ کے شاگردوں سے حارث بن عمرو ثقفی نے روایت کیا ہے، اور یہ راوی مجہول العین نہیں ہے، کیوں کہ امام شعبہ نے ان کی نسبت کہا ہے کہ وہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے بھتیجے ہیں، اور مجہول الحال بھی نہیں ہیں، کیونکہ وہ کبار تابعین کی فہرست اور ابوعون ثقفی کے اساتذہ کے ضمن میں ہیں، اور ماہرین فن میں سے کسی نے ان پر ایسی کوئی جرح نقل نہیں کی ہے جو مفسَّر ہو۔ اور اگر

کوئی بڑے درجے کا تابعی کوئی حدیث روایت کرے تو اس کی روایت پر صحیح ہونے کا حکم لگانے کے لیے اسی کے ہم عصر و ہمسر لوگوں کی جانب سے اس کی توثیق نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے عادل ہونے اور اس کی روایت کو قبول کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ اصحاب فن کی طرف سے اس کی جرح مفسَّر ثابت نہ ہو۔ کیونکہ اس طبقہ کے مجروح راویوں کی پوری تلاش وجستجو اور چھان پھٹک ہو چکی ہے، لہٰذا ایسا راوی جس کی نسبت اصحاب فن کی طرف سے ایسی جرح نہ ثابت ہو جو اس پر اثر انداز ہو سکے، مقبول الروایۃ ہوتا ہے۔ دیکھئے! جہاں تک صحابہؓ کا معاملہ ہے، وہ سب کے سب عادل ہیں، اگر ان کے اوپر کوئی جرح کرے تو وہ اثر انداز ہی نہیں ہوگی، اس پر جمہور علماء وائمہ کا اتفاق ہے۔ رہے تابعین تو ان کے بھی خیر ہونے کی شہادت دی گئی ہے، لہٰذا جب تک ان کے بارے میں کوئی مؤثر جرح نہ ثابت ہو، وہ عادل مانے جائیں گے۔ ہاں تابعین کے بعد کے جو لوگ ہیں تو ان کی روایت اس وقت تک قبول نہیں کی جائے گی، جب تک ان کی عدالت ثابت نہ ہو جائے۔ یہ ایسا فیصلہ ہے جس کی طرف صحیح فکر اور روشن دلیلیں رہنمائی کرتی ہیں۔ لہٰذا جو شخص اس معاملے میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کو ایک ہی مقام پر رکھے اور ایک ہی حیثیت سے دیکھے، تو اس نے جس کا جو مقام ہے اس مقام پر نہیں رکھا، صحیح بخاری میں کتنے ایسے راوی ہیں جن کا ثقہ ہونا بتصریح نقل نہیں کیا گیا، مگر ان کے بارے میں کوئی جرح ثابت نہیں ہے، اس لیے ان کی روایت صحیح میں داخل کر دی گئی ہے، جیسا کہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں متعدد مقام پر اس کو بیان کیا ہے۔ اور حارث بن عمرو کو ابن حبان نے کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے، اور عقیلی، ابن الجارود اور ابوالعرب نے اگر ان کو مجہول کہا ہے، تو ان کی مراد اس راوی کے حال کا نامعلوم ہونا ہے، اس طور پر کہ ان کو اس کے بارے میں صراحتاً کسی کی توثیق نہیں ملی، اور کبار تابعین کے بارے میں اس طرح کی ناواقفیت کا حکم ہم بیان کر چکے ہیں۔

اور یہ کہہ کر کہ اس حدیث کو حارث بن عمرو ثقفی سے روایت کرنے والے ابوعون متفرد ہیں، اس کو کمزور نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ کسی غیر مجروح راوی کے متفرد ہونے کی وجہ سے کسی حدیث کو رد کر دینا نہ اہل سنت کا طریقہ ہے، نہ اہل حق کا اصول۔ ابوعون محمد بن عبیداللہ ثقفی وہ راوی ہیں جن سے اعمش، ابوحنیفہ، سفیان ثوری، ابواسحاق شیبانی، مسعر اور شعبہ جیسے لوگوں نے روایت کیا ہے، وہ صحیحین کے رجال میں سے ہیں، اور ان کے ثقہ ہونے پر ماہرین فن کا اتفاق ہے۔

ابوعون سے اس حدیث کو ابواسحاق شیبانی اور شعبہ نے روایت کیا ہے، اور روایت کے باب میں شعبہ کی سختی مشہور ہے، اور یہ تسلیم شدہ ہے کہ شعبہ کی روایت کردہ حدیث کی سند میں جو راوی ہوتے ہیں وہ

مجہول الحال نہیں رہتے۔ پھر ابواسحاق شیبانی سے اس کو ابومعاویہ ضریر نے روایت کیا ہے، اور ابومعاویہ سے سعید بن منصور اور ابن ابی شیبہ نے۔ شعبہ سے اس کو روایت کرنے والے یحییٰ بن سعید قطان، عثمان بن عمر عبدی، علی بن الجعد، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن مبارک، اور ابوداؤد طیالسی وغیرہ ہیں؛ اور مؤخرالذکر لوگوں سے اس کو روایت کرنے والے بے شمار حضرات ہیں، یہاں تک کہ فقہاء تابعین وتبع تابعین نے اس کو قبول کیا، اور اس حدیث سے جو اصل اور قاعدہ مستنبط ہوتا ہے، اس پر ان کا عمل درآمد رہا۔

حارث نے اس حدیث کو روایت کرتے ہوئے جو یہ کہا ہے کہ "**عن أصحاب معاذ من أهل حمص، عن معاذ**" تو اس کی وجہ سے اس کو کمزور قرار دینے کی یہ کہہ کر کوشش کرنا کہ حضرت معاذؓ کے اصحاب نامعلوم لوگ ہیں، اور نامعلوم لوگوں کی روایت ناقابل قبول ہوتی ہے۔ تو یہ ایک بدترین کوشش ہے، کیونکہ حضرت معاذؓ کے اصحاب (تلامذہ اور شاگرد) دینداری اور ثقاہت میں معروف ہیں، ان کے بارے میں بہ تصریح کوئی جرح ثابت نہیں کی جاسکتی۔ اور حارث نے کسی کا نام لیے بغیر جو صرف **أصحاب معاذ** کہہ دیا ہے، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ از روئے روایت یہ حدیث مقام شہرت تک پہنچی ہوئی تھی، یہاں تک کہ اس کو امت میں قبول عام حاصل ہوا۔

امام ابوبکر بن العربی نے **عارضة الأحوذی** میں لکھا ہے کہ: "اصحاب معاذ میں سے کوئی مجہول نہیں ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ (روایت کرنے والوں کی) پوری ایک جماعت ہونے کی وجہ سے ان کے ناموں کو نہ ذکر کیا گیا ہو، اس سے ان پر جہالت (مجہول ہونے) کا اطلاق نہیں ہوسکتا، جہالت تو اس وقت مانی جائے گی جب کہ راوی ایک ہو اور یہ کہا جائے کہ مجھ سے ایک شخص یا ایک آدمی نے یہ بیان کیا، اور بیان کرنے والا جس سے سن کر بیان کررہا ہے، اس کا کوئی مخصوص شاگرد نہ ہو، اور یہاں تک کہ "اصحاب" کے لفظ کے ساتھ ساتھ ان کے معروف ہونے کے لیے یہ بھی بڑھا دیا گیا کہ ایک شہر کی طرف ان کو منسوب کیا گیا، اور امام بخاری جنھوں نے اپنی کتاب میں روایت کی ہوئی حدیثوں کے لیے صحیح ہونے کی شرط لگائی ہے، انھوں نے عروہ بارقی کی ایک حدیث ان الفاظ میں روایت کی ہے کہ "**سمعت الحي يحدثون عن عروة**" اور "**الحي**" کے لفظ کی وجہ سے یہ حدیث مجہول روایتوں کے خانے میں نہیں رہی، اور امام مالک نے قسامۃ کے مسئلے میں فرمایا ہے کہ "**أخبرني رجال من كبراء قومه**"، اور صحیح (مسلم) میں زہری سے مروی ہے: **حدثني رجال عن أبي هريرة: من صلى على جنازة فله قيراط.**[1]

(۱) مذکورہ بالا تینوں روایتوں میں صحابی سے روایت کرنے والے راویوں کا نام مذکور نہیں ہے، بلکہ الحي (محلے والے) اور رجال (بہت سے لوگ، یا چند لوگ) کا لفظ ہے، جو کہ نامعلوم ہیں، مگر یہ روایتیں بخاری ومسلم میں ہیں، کیونکہ اس سے متعدد لوگوں کا روایت کرنا معلوم ہوتا ہے (مترجم)

ابن العربی کا یہ کلام ابن زنجویہ نے بخاری سے تاریخ میں جو نقل کیا ہے، اس کے بارے میں قول فیصل کا درجہ رکھتا ہے، جب کہ علی بن الجعد کی روایت میں شعبہ کا لفظ یہ ہے کہ: ''**قال: سمعت الحارث بن عمرو ابن أخي المغيرة بن شعبة يحدث عن أصحاب رسول الله** ﷺ، **عن معاذ بن جبل** ''، جیسا کہ اس کو ابن ابی خیثمہ نے تاریخ اور ابن عبد البر نے **جامع بیان العلم** میں روایت کیا ہے، اور صحابۂ کرامؓ میں سے بہت سے لوگ حضرت معاذؓ کے شاگرد ہوئے، تو اس کی رو سے حضرت معاذؓ کے وہ شاگرد جن سے حارث نے سنا ہے، صحابۂ کرام بھی ہوں گے، اور اس جیسی روایت جمہور علماء حدیث کے نزدیک مجہول نہیں ہوگی، اور ایسے راویوں کو مجہول شمار کرنا بے سر پیر کی بات کہنا ہے، اور خشک طبیعت کے لوگ اسی طرح قوی کو ضعیف بناتے ہیں۔

ابوبکر رازی نے اپنے اصول میں لکھا ہے کہ: ''اگر کوئی یہ کہے کہ حارث نے اس کو حضرت معاذؓ کے نامعلوم شاگردوں سے روایت کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ یہ اس کے لیے مضر نہیں ہے، کیونکہ حضرت معاذؓ کے متعدد شاگردوں کی طرف اس کی نسبت کرنا اس کی تاکید کا موجب ہے، اس لیے کہ راویان حدیث کسی شخص کے شاگردوں پر ''**أصحابه**'' کا اطلاق اسی وقت کرتے ہیں جب کہ وہ ثقہ اور مقبول الروایۃ ہوتے ہیں۔ اور دوسری حیثیت سے یہ خبر ایسی ہے جس کو تلقی بالقبول حاصل ہے، اور اس کے راویوں پر کسی نکیر یا رد وکد کے بغیر لوگوں میں معروف ومشہور ہے (یعنی قرون اولی میں اس کو شہرت وقبولیت حاصل رہی ہے)۔ ورنہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مرسل ہے، اور ہمارے نزدیک مرسل روایت بھی مقبول ہوتی ہے''۔

اور تائید کے وقت مرسل کو قبول کرنا ائمۂ متبوعین کے نزدیک متفق علیہ ہے، اور کتنی ایسی دلیلیں ہیں، جو اس حدیث کے مضمون کی تائید کرتی ہیں، یہاں تک کہ سب مل کر اصطلاحی صحت تو درکنار معنوی تواتر کی حد تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور یہ بات تو ہم تحقیق سے ثابت کر چکے ہیں کہ اس روایت میں انقطاع سرے سے ہے ہی نہیں، اور امام رازی نے جو اس کو مرسل کہا ہے تو وہ علی سبیل الافتراض ہے۔

حافظ ابوبکر بن العربی نے لکھا ہے کہ: ''اس حدیث میں لوگوں کا اختلاف ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ درجۂ صحت کو پہنچی ہوئی نہیں ہے، اور بعض دوسرے لوگوں نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، میں اس کو صحیح مانتا ہوں، اس لیے کہ وہ حدیث مشہور ہے، جس کو شعبہ بن الحجاج نے روایت کیا ہے، اور شعبہ سے اس کو فقہا وائمہ نے روایت کیا ہے''۔

اور خطیب بغدادی نے اپنی کتاب ''الفقیہ والمتفقہ'' میں لکھا ہے کہ حارث بن عمرو کا قول ''عن أناس من أصحاب معاذ'' اس حدیث کی شہرت اور اس کے راویوں کی کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت معاذؓ کا مقام و مرتبہ اور ان کا زہد وتقویٰ معروف ومشہور ہے، اور ''ان کے اصحاب'' کے حال کا بھی ظاہر یہی ہے کہ وہ دیندار، ثقہ اور زہد وصلاح کے حامل ہوں گے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کو عبادہ بن نُسَی نے عبدالرحمٰن بن غنم سے، اور عبدالرحمٰن نے معاذ سے روایت کیا ہے۔ یہ سند متصل ہے، اور اس کے تمام راوی ثقاہت میں معروف ہیں، علاوہ بریں اہل علم نے اس کو قبول اور اس سے استدلال کیا ہے، تو اس سے ہم کو یہ علم ہوا کہ وہ ان کے نزدیک صحیح حدیث ہے۔

اس پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ یہ حدیث تمام فقہاء ومحدثین کے نزدیک صحیح وثابت ہے، بلکہ اپنے قرائن سے مل کر اس کا مضمون تواتر معنوی کی حد تک پہنچ جاتا ہے، اگر اس حدیث کے طرق کو میں صرف ان کتابوں سے نقل کرنے لگوں جن کا اوپر ذکر آیا ہے - چہ جائیکہ تمام کتابوں سے اور اس سلسلے کی تمام روایتوں سے ان کو ذکر کیا جائے - تو سلسلۂ کلام دراز ہوجائے گا، اور پڑھنے والا تھک جائے گا، اور جتنا ذکر کیا جاچکا ہے، اس حدیث کا درجہ جاننے کے لیے وہی کافی ہے۔

اس بحث وگفتگو کا محرک یہ ہے کہ آج کل اس حدیث کے بارے میں بہ کثرت سوالات کیے جاتے رہتے ہیں، چنانچہ لوگوں کو آج ایسے ان پڑھ جاہلوں سے واسطہ پڑتا ہے، جو ہر کس وناکس سے نقل کی ہوئی حدیث کے زعم میں قیاس شرعی کا انکار کرتے ہیں، یہ لوگ حدیث اور فقہ سے نابلد ہیں، بلکہ یہ لوگ شیطان کے مددگار اور خواہشات نفس کے شکار ہیں، یہ لوگ اپنی بے راہ روی اور حق وصداقت سے دور ہوکر مسلمانوں کے اندر انتشار اور پھوٹ پیدا کرتے ہیں، ان کا سب سے نمایاں اور خاص وصف خواہش نفس کی پیروی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں پر واجب اور ضروری ہے کہ ان کی بکواس کی طرف دھیان نہ دیں، اور پوری سچائی کے ساتھ اس راستے پر چلیں جو بہترین اور ائمۂ دین کا راستہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ جس مسئلے میں کتاب وسنت کی کوئی نص یا اجماع امت سے اس کا حکم معلوم نہ ہو، احکام کی احادیث کی پوری تلاش وجستجو کے ساتھ ان لوگوں کے قیاس کو قبول کیا جائے جو اس کے اہل ہوں، تاکہ شریعت کے فروعی مسائل میں مروی احادیث کے رتبوں کو ان کے ثبوت کی حیثیت سے سند ومتن اور قوت وضعف کے بارے میں اور دلالت کی حیثیت سے ان کے وضوح وخفا کے بارے میں ہم پوری طرح باخبر ہوں اگر ہم احکام کے دلائل سے تھوڑی بھی واقفیت رکھنا چاہتے ہیں۔ اور توفیق اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

أحكام السواک

مسواک کے احکام اور اس کے فضائل

(آخری قسط)

للدكتور : عبدالله بن معتق السهلي ترجمہ: مولانا فرید الحق صاحب
استاذ مرقاۃ العلوم، مئو

آٹھویں بحث: کس قسم کی لکڑی سے مسواک کرنا چاہئے

مستحب اور افضل ہے مسواک کے لیے ایسی لکڑی کا استعمال کرنا جو نرم اور منھ کو صاف کرنے والی ہو، نقصان پہنچانے والی اور زخمی کرنے والی نہ ہو اور نہ اس کے اجزا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر منھ میں رہ جائیں مثلاً درخت پیلو، کھجور اور درخت زیتون کی لکڑی۔

درخت پیلو کی مسواک تمام مسواکوں میں سب سے افضل ہے کیونکہ اس میں عمدہ خوشبو اور ریشے ہوتے ہیں جو دانتوں کے درمیان میں پھنسے ہوئے اجزاء کو باہر کر کے منھ اور دانت کو بالکل صاف کر دیتے ہیں، نیز اللہ کے نبی ﷺ پیلو ہی کے مسواک کو زیادہ پسند فرماتے تھے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے لیے پیلو کی مسواک چنتا تھا۔

حکماء اور اطباء نے درخت پیلو کے فوائد پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کے مختلف نتائج کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے جس میں سے بعض یہ ہیں۔

۱:- درخت پیلو میں ایسی کڑواہٹ ہوتی ہے جو گندگی اور بُو کا قلع قمع کر دیتی ہے جیسا کہ وہ منھ کی صفائی میں معتبر مانی گئی ہے نیز دانتوں سے خون کے نکلنے کی صورت میں یعنی پیریا کی بیماری میں اس کا ستعمال مشہور اور انتہائی مفید ہے۔ دانتوں سے خون کے بہنے کو روکنا اور معمولی زخموں کے لیے بے حد شفا بخش ہے۔

۲:- پیلو کی لکڑی میں رائی کے دانہ کے مشابہ ایک ایسا مادہ پایا جاتا ہے جو منھ کے جراثیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے اس کی بو تیز اور مزہ سخت جلد دینے والا ہوتا ہے جسے استعمال کرنے والا اول وہلہ میں محسوس کرتا ہے۔

۳:- پیلو کی مسواک میں ایسا مادہ ہوتا ہے جو دانتوں کی کیڑوں سے حفاظت کرتا ہے اور علماء طب نے پیلو کی ابحاث میں اس بحث پر انتہائی زوردار کلام کیا ہے پیلو ہی ایک ایسا درخت ہے جس میں خوردبین سے نظر آنے والے چھوٹے چھوٹے جراثیم کے مارنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔

پیلو کی مسواک کے بعد کھجور کی لکڑی سے مسواک کرنا افضل ہے حضرت عائشہؓ کی حدیث کی وجہ سے جس میں آپ نے فرمایا کہ نبی علیہ السلامﷺ کے مرض وفات میں حضرت عبدالرحمٰنؓ کھجور کی ہری مسواک ہاتھ میں لیے ہوئے حاضر ہوئے آپؐ نے اسے دیکھا تو میں سمجھ گئی کہ آپؐ اس سے مسواک کرنا چاہتے ہیں میں نے اسے لے لیا اور چبا کر آپ کو دی آپ نے بہت اچھی طرح اسے دانتوں پر ملا پھر وہ مسواک مجھے دیتے وقت آپ کا ہاتھ مبارک گر گیا یا مسواک آپ کے ہاتھ سے گر پڑی اللہ تعالیٰ (کا فضل تھا کہ اس نے) آپﷺ دنیا کے آخری دن اور آخرت کے پہلے دن میں میرے اور آپ کے لعاب مبارک کو ملا دیا (بخاری ج ۶ ص ۱۴۲)

بعض حضرات نے زیتون کی مسواک افضل ہونے پر ضعیف احادیث سے استدلال کیا ہے جو ایک بابرکت درخت ہے۔

برش اور ٹوتھ پیسٹ کا استعمال مسواک کے قبیل سے ہے، برش کے دندانے دانتوں کے اندر کے حصہ کو صاف کرنے میں لکڑی کی مسواک کے مانند ہیں ٹوتھ پیسٹ اور منجن میں ایسے مادے ہیں جو دانت کو صاف کرنے اور منھ کی بو کو زائل کرنے میں مسواک ہی کی طرح اہم رول ادا کرتے ہیں۔

مستحب ہے کہ ایسی نرم لکڑی سے مسواک نہ کی جائے جو نہ دانتوں کی زردی کو دور کر سکے اور نہ بو کو زائل کر سکے اور نہ ایسی خشک مسواک کرنا چاہئے جو مسوڑھوں کو زخمی کر دے۔

ریحان اور بانس کی لکڑی سے مسواک کرنا مکروہ ہے اس لیے کہ یہ دونوں بعض امراض کا سبب ہیں ابن قدامہؒ نے ذکر کیا ہے کہ ریحان، چنبیلی اور خوشبودار لکڑیوں سے مسواک کرنا مکروہ ہے اور بعض علماء نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ بھوسہ، بانس، اشنان اور جڑی بوٹی کی لکڑی سے مسواک کرنا

مکروہ ہے اور ایسی لکڑی جس کی اصل معلوم نہ ہو اسے مسواک کرنا مناسب نہیں، ابن قیم فرماتے ہیں کہ نامعلوم درخت کی لکڑی کو مسواک کے طور پر استعمال کرنا مناسب نہیں ہے کیونکہ بسا اوقات اس میں زہر ہوتا ہے جس سے نقصان کا سخت اندیشہ ہے۔

انگلی سے مسواک کرنا

انگلی سے مسواک کرنے کی دوصورت ہے، انگلی یا تو نرم اور چکنی ہوگی یا سخت اور کھردری ہوگی، پہلی صورت میں اسے مسواک کا درجہ بالاتفاق نہیں دیا جائے گا اور دوسری صورت میں اختلاف ہے بعض کی رائے یہ ہے کہ وہ مسواک کے حکم میں ہے اور بعض کا قول ہے کہ وہ مسواک کے حکم میں نہیں ہے، قول اول کے قائلین فرماتے ہیں کہ مسواک کا جو مقصد ہے وہ انگلی کے دانت پر رگڑنے سے حاصل ہوتا ہے لہذا اسے مسواک کا درجہ دینے میں کوئی حرج نہیں یہی احناف، مالکیہ، اور حنابلہ کا قول ہے امام نوویؒ اور ابن قدامہ نے اسی کو پسند فرمایا ہے۔

قول ثانی کے قائلین کا کہنا ہے کہ مسواک منھ کو صاف کرنے اور دانتوں کی زردی کے دور کرنے میں جو رول ادا کرتی ہے دانتوں پر انگلیوں کے پھیرنے میں یہ بات نہیں ہے لہذا اسے مسواک کا بدل نہیں قرار دیا جاسکتا۔

جو لوگ انگلی کو مسواک کا درجہ دیتے ہیں انھوں نے چند احادیث سے استدلال کیا ہے۔

(۱) انس بن مالکؓ کی حدیث: - ایک انصاری صحابیؓ نے جن کا تعلق قبیلہ بنی عمرو ابن عوف سے ہے انھوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ آپ ہمیں مسواک کے بارے میں ترغیب دیتے ہیں اگر مسواک نہ ہو تو کیا اس کا اور کوئی بدل ہے، اللہ کے رسول نے فرمایا "**اصبعاک سواک عند وضوءک تمرها على اسنانک، انه لا عمل لمن لا نية له ولا اجر لمن حسنة له**" (اخرجہ البیہقی فی سننہ ج ا ص ۴۱) تمھاری دو انگلی جس کو تم وضو کے وقت اپنے دانتوں پر پھیرتے ہو وہ مسواک ہی ہے اس شخص کا عمل معتبر نہیں جس میں نیت نہ ہو اور اس کے لیے کوئی اجر نہیں جسے ثواب کی امید نہ ہو۔

(۲) حدیث انس رضی اللہ عنہ: - حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے نقل کرتے ہیں "**يجزى من السواک الأصابع**" (بیہقی ج ا ص ۴۰) انگلیاں مسواک کی طرف سے کافی ہیں۔

جن حضرات نے انگلیوں کو مسواک کا حکم نہیں دیا ہے انھوں نے بطور دلیل کے کئی وجہیں بیان کی ہیں:

۱:- شریعت نے دانتوں کو انگلیوں سے رگڑنے کو مسواک نہیں کہا اور نہ اس سلسلہ میں کوئی مضبوط روایت ہے لہذا اسے مسواک کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔

۲:- شریعت اور عرف عام میں انگلی سے منھ صاف کرنے کو مسواک کا نام نہیں دیا جاتا ہے اور نہ اس سے ایسی صفائی حاصل ہوتی ہے جیسی لکڑی سے حاصل ہوتی ہے اس لیے اسے مسواک سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ مختار اور پسندیدہ قول انھیں حضرات کا ہے جو انگلیوں کو مسواک درجہ دیتے ہیں اور حافظ عراقیؒ نے بھی ان کی تائید کی ہے کیونکہ انگلیاں اور مسواک نظافت اور منھ کو صاف کرنے میں برابر ہیں۔

فیصلہ کن بات یہ ہے کہ انگلیاں مسواک کے درجہ میں اس وقت ہوں گی جب کہ لکڑی کی مسواک موجود نہ ہو لکڑی کے ہوتے ہوئے انگلی سے دانت کے رگڑنے کو مسواک نہیں قرار دیا جا سکتا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم) (سورہ تغابن آیت ۱۶) اپنی طاقت اور استطاعت کے بقدر اللہ سے ڈرو، نبی کا فرمان ہے ''إذا أمرتکم فأتوا منہ ما استطعتم'' (بخاری ج ۲ ص ۱۸۲) جب میں تم لوگوں کو کسی کام کا حکم کروں تو اپنی استطاعت کے مطابق اسے انجام دو۔

بہر حال مسواک کی عدم موجودگی میں انگلی کو مسواک کے قائم مقام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ بھی دراصل مسواک ہی کرنا ہے شریعت میں اس کی نظیریں کئی ایک ہیں، فقہاء کرامؒ کا کہنا ہے کہ عمرہ اور حج کے احرام سے نکلنے کے لیے حلق یا قصر ضروری ہے اگر کوئی حاجی ایسا ہو جس کے سر پر بالکل بال نہ ہو تو اسے بھی حلال ہونے کے لیے سر پر استرہ پھیروانا ضروری ہوگا اور وہ حلق یا قصر کے درجہ میں ہوگا۔

نویں بحث
مسواک کا طریقہ

مستحب ہے کہ مسواک کرنے میں منھ کے داہنے جانب سے ابتدا کی جائے کیونکہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے جس میں آپ فرماتی ہیں ''کان النبی ﷺ یعجبہ

التیامن فی تنعله وترجله وطهوره وفی شانه کله" (بخاری ج۲ص۵۰) کہ آپ جوتا پہنے، کنگھی کرنے، اور اپنے ہر کام میں داہنی طرف سے ابتدا کو پسند فرماتے تھے نیز مسواک وضو ہی کا ایک جزو ہے اس لیے داہنے طرف سے شروع کرنا افضل ہوگا۔

جمہور فقہا کرامؒ فرماتے ہیں کہ چوڑائی میں یعنی دانتوں کے اوپر نیچے مسواک کرنا مستحب ہے، اس پر متعدد دلائل ہیں:

(۱) ربیعہ بن اکثم کی حدیث: - وہ فرماتے ہیں **کان رسول اللّٰہ ﷺ یستاک عرضا ویشرب مصا ویقول هو اهنأ وامرأ** (نہایہ شرح الہدایہ میں ج۱ص۱۴۳) کہ اللہ کے نبی ﷺ چوڑائی میں مسواک کرتے تھے اور پانی گھونٹ گھونٹ کر پیتے تھے اور کہتے تھے یہ انتہائی خوشگوار اور نفع بخش ہے۔

(۲) عطاء بن ابی رباح کی حدیث: - وہ فرماتے ہیں **قال رسول اللّٰہ ﷺ اذا شربتم فاشربوا مصا واذا استکتم فاستاکوا عرضا** (بیہقی ج۱ص۴۰) کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جب تم پانی پیو تو گھونٹ گھونٹ کر کے پیو اور جب مسواک کرو تو چوڑائی میں کرو۔

(۳) طول میں مسواک کرنے کا دو نقصان ہے ایک مسوڑھوں کا چھل جانا دوسرے دانتوں کی جڑ کا خراب ہو جانا۔

مسواک کا طریقہ یہ ہے کہ مسواک کرنے والا دانتوں کے ظاہر اور باطن کو چوڑائی میں ڈاڑھ کے دانت اور اس کے علاوہ دوسرے دانتوں پر مسواک کو پھیرے اور حلق کے اوپر کو بھی مسواک سے ہلکا رگڑے۔

بعض فقہاء مثلاً حنفیہ میں سے غزنوی، امام الحرمین، امام غزالی، اور بعض حنابلہ کا خیال ہے کہ طول میں مسواک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور مستحب ہے مسواک سے زبان کو صاف کرنا جیسا کہ ابو بردہ کی حدیث میں ہے ان کے والد فرماتے ہیں کہ میں اللہ کے نبی ﷺ کے پاس آیا دیکھا کہ آپ ﷺ مسواک کر رہے ہیں اور اُع اُع کی آواز نکل رہی ہے گویا کہ آپ ﷺ قے کر رہے ہوں اور مسواک آپ ﷺ کے منہ میں تھی (معالم السنن ج۱ص۴۳) حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسواک لمبائی میں کرنا بھی ایک مسنون عمل ہے۔ (فتح الباری ج۱ص۳۵۶)

کیا داہنے ہاتھ سے مسواک کرنا افضل ہے یا بائیں ہاتھ سے

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ اگر مسواک وضو کے قبیل سے ہو تو دائیں ہاتھ کا استعمال افضل ہے اور اگر صرف منھ کی صفائی اور بُو کو زائل کرنے کے لیے ہو تو بائیں ہاتھ سے کرنا اولیٰ ہے (حاشیہ ابن عابدین ج ۱ ص ۱۱۴) حافظ عراقیؒ نے اسی جیسی بات کا ذکر کیا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے دائیں اور بائیں ہاتھ سے مسواک کرنے کے بارے میں سوال کیا گیا۔

تو آپ نے فرمایا کہ بائیں ہاتھ سے افضل ہے کیونکہ مسواک کا مقصد گندگی اور بو کو دور کرنا ہے جیسے ناک صاف کرنا اور رینٹ باہر کرنا اس کے علاوہ گندگی اور نجاست کو صاف کرنے کے دوسرے مواقع اس میں بائیں ہاتھ کا استعمال افضل ہے لہذا مسواک میں بھی بائیں ہاتھ کا ہی لگانا بہتر ہوگا نیز فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے مسواک کرنا اس کی تعظیم کے قبیل سے نہیں ہے (فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ج ۲۱ ص ۱۵۸)

مسواک کرنے سے پہلے اور اس کے بعد مسواک کو دھونا مستحب ہے جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے وہ فرماتی ہیں ''**كان رسول الله ﷺ يعطيني السواك لاغسله فأبدأ به فاستاك ثم اغسله ثم ادفعه اليه**'' (ابوداؤد) کہ اللہ کے رسول ﷺ مجھے مسواک دیتے تھے تاکہ میں اس کو دھوؤں اس کے بعد پہلے میں مسواک کرتی تھی اور دھونے کے بعد حضور ﷺ کو دیدیتی تھی۔

ایک مسواک ایک سے زیادہ افراد استعمال کر سکتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ''**كان رسول اللّٰه ﷺ يستن وعنده رجلان احدهما اكبر من الآخر فاوحى اللّٰه اليه فى فضل السواك ان كبر اعط السواك اكبرهما**'' (ابوداؤد ج ۱ ص ۴۳) کہ اللہ کے رسول ﷺ مسواک کر رہے تھے اور دو آدمی آپ ﷺ کے پاس تھے ان میں سے ایک دوسرے سے بڑا تھا دریں اثنا مسواک کی فضیلت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ بڑے کو بڑائی دو آپ ﷺ نے ان میں سے بڑے شخص کو مسواک دیدی، خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں اشارہ ہے اس بات کی جانب کہ غیر کی مسواک استعمال

کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ نہیں ہے جیسا کہ بعض بے حیثیت لوگوں کی رائے ہے، لیکن سنت یہ ہے کہ اس کو دھو کر استعمال کیا جائے۔ (معالم السنن ج ۱ ص ۴۳)

دسویں بحث
مسواک کے فوائد

مسواک کا سب سے بڑا فائدہ وہ ہے جس کی صراحت اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے مبارک ارشاد "**السواک مطهرة للفم مرضاة للرب**" میں فرمائی ہے کہ مسواک منھ کی صفائی اور رب کی خوشنودی کا سبب ہے۔

اہل علم نے اس کے فوائد میں ذکر کیا ہے کہ مسلمان کو ہر حال میں اچھی خصوصا عبادات کے ادا کرنے کے وقت اچھی ہیئت اور پاکیزہ خوشبو میں رہنے کا حکم دیا گیا اس لیے اسے اس امر کا لحاظ کرنا چاہئے تا کہ عبادتیں کامل طور پر ادا ہوں اور اس کی عظمت کا اظہار بھی ہو۔

(طرح التثریب ج ۲ ص ۶۶)

فرشتے اللہ تعالیٰ کی ایک پاکیزہ مخلوق ہیں اور انھیں گندگی اور ناپاکی سے حد درجہ نفرت اور اس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے جیسا کہ انسانوں کو گندگی مکروہ اور ناپسندیدہ معلوم ہوتی ہے اسی لیے منھ کی صفائی کے لیے مسواک کو مشروع اور مسنون قرار دیا گیا، تا کہ وہ فرشتے جو انسانوں کے اعمال کو لے کر آسمان پر لے جانے کے لیے متعین کیے گئے ہیں وہ بنو آدم کے اعمال کو ناپسندیدہ بو کے ساتھ لے کر آسمان پر نہ چڑھیں جو مسواک کے نہ کرنے کی بنا پر منھ میں پیدا ہوئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تمھارے منھ قرآن کے راستے ہیں (اس لیے کہ اسی سے قرآن کی تلاوت کرتے ہو) لہذا اسے پاک صاف رکھو اور مسواک کا اہتمام کرو (ابن ماجہ ج ۱ ص ۱۰۶)

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ مسواک میں دینی اور دنیاوی کئی ایک فائدے ہیں (۱) منھ میں صفائی رہتی ہے۔ (۲) مسوڑھے مضبوط ہوتے ہیں۔ (۳) مسواک بلغم کو ختم کرتی ہے اور آنکھ کی بینائی کو تیز کرتی ہے۔ (۴) آنکھ کے میل کو دور کرتی ہے، اور معدہ کو تندرست بناتی ہے۔ (۵) اس سے آواز میں صفائی ہوتی ہے اور آواز کھل کر نکلتی ہے۔ (۶) مسواک کھانے کے ہضم ہونے میں مدد دیتی ہے اور کلام کے مخارج کو آسان بناتی ہے۔ (۷) مسواک سے قرآن کی تلاوت، بقیہ صفحہ ۳۶ پر

اسلامی کتب خانے

(چودہویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی — ترجمہ و تلخیص: مسعود احمد الاعظمی

اندلس کے خلفاء بنی امیہ کا کتب خانہ:

اندلس (اسپین) والوں کی کتابوں کے ساتھ شیفتگی، علم وادب کے ساتھ ان کی دلچسپی، اور فن وثقافت کی نشر واشاعت میں ان کا کردار اور سرگرمی مشہور ومعروف ہے، جس کے متعلق تفصیل کے ساتھ گفتگو ہو چکی ہے، حتی کہ اندلس دنیا میں ثقافت وتمدن کا اتنا عظیم الشان مرکز بن گیا تھا، جہاں اہل علم وادب اور تشنگان علم ومعرفت دنیا کے گوشے گوشے سے سفر کر کے آتے تھے۔

مملکت اسلامیہ کے اس خطے میں کتب خانوں نے غیر معمولی ترقی کی، اور وہ اس تہذیب کا نتیجہ تھا جس کو اسلام نے وہاں وجود بخشا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اندلس کا اسلامی تمدن مشرق کے اسلامی تمدن سے مقابلہ کر رہا تھا، قرطبہ کی عظمت وشوکت اور ترقی کا یہ حال تھا کہ مقرّی نے اس کی نسبت لکھا ہے ''اسلامی شہروں میں سب سے زیادہ اس میں کتابیں ہیں [1]''۔ اس کی یہ عظمت وترقی اندلس کے عہد اسلامی میں خاص طور پر رہی ہے، اُس وقت وہ پورے یورپ کا سب سے بڑا شہر تھا، اور اسلامی مشرق جیسے بغداد وقسطنطنیہ جیسے تہذیبی روشنی کے مراکز کا ان کے عروج کے دور میں ہم پلہ تھا، بلکہ بغداد کے بعد تہذیب وثقافت اور فکر وبصیرت کا دارالحکومت سمجھا جاتا تھا۔

اندلس کی اسلامی تہذیب کے کمال عروج کے دور میں صرف قرطبہ میں تقریباً ۷۰ عوامی کتب خانے (پبلک لائبریریاں) تھے۔[2]

---

(۱) نفح الطیب: ۱/۴۶۳

(۲) الکتب الإسلامیۃ، از: امان محمد: ٦٦

بعض مؤرخوں نے قرطبہ کے اُس زمانۂ عروج میں اس کے باشندوں کی تعداد کا تخمینہ بیس لاکھ، اس کی مسجدوں کی تعداد کا ایک ہزار چھ سو (۱۶۰۰) لگایا ہے، دولاکھ مکانات اور اسی ہزار (۸۰۰۰۰) محلات تھے، ازاں جملہ امویوں کا تعمیر کردہ قصر دمشق بھی تھا، جس کو انھوں نے ملک شام کے اپنے محلات کے طرز پر تعمیر کرایا تھا۔[1]

قرطبہ کے شاداب مشرقی علاقے میں ایک سوستر (۱۷۰) عورتیں ایسی تھیں، جو خط کوفی میں قرآن کریم کی کتابت کرتی تھیں۔[2] یہ صرف ایک حصے کی بات ہے، تو باقی حصوں کا کیا حال رہا ہوگا۔ بلکہ قرطبہ میں علم وفن کی بہت سی ایسی دلدادہ عورتیں تھیں، جو کتابیں جمع کرنے کا شوق وشغف رکھتی تھیں، ان باکمال خواتین میں عائشہ بنت احمد بن محمد بن قادم تھیں، جن کی نسبت ابن بشکوال نے لکھا ہے کہ:

''قرطبہ کی رہنے والی تھیں، ان کے وقت میں علم ودانش، شعروادب اور زبان آوری میں پورے جزیرۂ اندلس میں ان کے ہم رتبہ کوئی عورت نہیں تھیں، بادشاہوں کی تعریف اوران سے گفتگو کرلیا کرتی تھیں، ان کا خط بہت عمدہ تھا، قرآن کریم اور رجسٹروں کی کتابت کیا کرتی تھیں، کتابیں جمع کرتیں اور علم میں مشغول رہتی تھیں، ان کا اپنا ذاتی ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا، ان کے پاس مال ودولت کی فروانی تھی، جس کو وہ فلاح وبہبود کے کاموں میں خرچ کیا کرتی تھی، ۴۰۰ھ میں ان کی وفات ہوئی''۔[3]

واقعہ یہ ہے کہ دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں اسلامی تمدن پورے مسلم اسپین میں پھیل چکا تھا، حتی کہ یہ تمدن مستعربین اور ہسپانویوں میں بھی منتقل ہو چکا تھا، یہ وہ عیسائی تھے جنھوں نے اسلامی قلمرو میں اقامت اختیار کی تھی، اور اسلامی حکومت کے زیر سایہ زندگی گزار رہے تھے، ان کے اندر اسلامی طور طریقے سرایت کر چکے تھے، انھوں نے عربی زبان سیکھ لی تھی، عربی میں لکھتے پڑھتے تھے، بلکہ ان لوگوں نے عربی کتابوں کے کتب خانے بھی بنا رکھے تھے۔

اندلس کے اندر بنوامیہ نے علم دوستی اور علماء نوازی میں سلطنت عباسیہ کا مقابلہ کرتے ہوئے

---

(۱) الإسلام والحضارة العربية: ۲۵۶/۱-۲۵۷

(۲) ایضاً (۳) الصلة: ۶۵۴/۲

عظیم الشام کوششیں صرف کی تھیں، اوراس سے کم کوشش ان کی کتب خانوں کے میدان میں، ان کے قائم کرنے، ان کی نگہداشت اوران پرتوجہ مبذول کرنے میں بھی نہیں تھی۔

اندلس کے بیشتر حکام، بالخصوص بنی امیہ، علم دوست اور معارف پرور تھے، علم ومعرفت کی نشر واشاعت کے لیے فکرمند تھے، جس کے واسطے انھوں نے ایسے ایسے عظیم الشان کتب خانے قائم کیے، جو دور دور مشہور تھے۔

ان کتب خانوں میں شہرۂ آفاق ''کتب خانہ قرطبہ'' تھا، جس کو امویوں نے قائم کیا تھا، اور خلفاء نے جس کی نگرانی کی تھی۔

عبدالرحمٰن اوسط نے تیسری صدی ہجری کے وسط میں قرطبہ میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی بنیاد نہاد کی، اور عباس بن ناجح کو دیار مشرق میں کتابوں کی تلاش وجستجو اور ان کے نقل کے لیے بھیجا۔

اسی طرح خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث ملقب بہ ''ناصر''-۳۰۰ھ=۳۵۰- نے علم وادب کے ساتھ اپنی دلچسپی کی طرح اس کتب خانے کے ساتھ بھی دلچسپی کا مظاہرہ کیا، اس کی معارف پروری کا یہ حال تھا کہ ہر جگہ کے اہل علم وادب اس کے دربار میں حاضر ہوتے تھے، اس نے کتب خانے کو غیر معمولی وسعت وترقی عطا کی، اور ہر زبان کی کتابوں کا اس میں ذخیرہ جمع کردیا۔

شہنشاہ قسطنطنیہ نے یونان وروم کی تاریخ سے متعلق متعدد کتابیں اور دیگر علمی کتابوں کا مجموعہ، اور جڑی بوٹیوں اوران کے طبی فوائد کے متعلق متعدد کتابیں بھیجی تھیں۔

عبدالرحمٰن ثالث کے دور حکومت میں کتب خانہ مستقل پھلتا پھولتا رہا، حتی کہ عالمی شہرت حاصل کرگیا، یہ اندلس کی اس تہذیبی وتمدنی ترقی کا ایک نمونہ تھا، جو اس کے عہد حکومت میں اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ چکی تھی۔

پھر اس کے لڑکے مستنصر باللہ ۳۵۰ھ-۳۶۶ھ=۹۶۲ء-۹۷۷ء کے عہد میں یہ کتب خانہ اپنی شہرت کے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا، جس نے اپنے والد سے علم دوستی، معارف پروری اور اعلی درجے کی تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ زمام حکومت اور بے حساب مال ودولت بھی پائی تھی، جس کا نتیجہ تھا کہ کتب خانے کی توسیع وترقی میں بے دریغ دولت صرف کی، اس کے لیے ہر علاقے سے

کتابیں منگوائیں، ابن خلدون نے اس کے تذکرے میں لکھا ہے کہ:

''علم وفن کا دلدادہ اور علماء نواز تھا، اس نے علم واہل علم کی بالا دستی قائم کی، اس وقت اندلس کے ہر خطے میں علم کا سکہ چلتا تھا''۔ (۱)

اور مقرّی نے اس کی نسبت لکھا ہے:

''بڑی تعداد میں ہر قسم کی کتابیں فراہم کی تھیں، اتنی بڑی تعداد میں اس سے پہلے کے کسی بادشاہ نے کتاب نہیں جمع کی تھی''۔ (۲)

اور ایک دوسرے مقام پر اس کی بابت لکھا ہے:

''چپے چپے اور گوشے گوشے سے کتابیں بہم پہنچائیں، اور اس کے لیے اتنی زیادہ دولت صرف کی کہ اس کا خزانہ تنگ پڑ گیا''۔ (۳)

بہت سے اسلامی شہروں میں مستنصر کے نمائندے تھے، جو اس کے واسطے مسلمان علماء کی تصنیفی وتالیفی کاوشوں کی فراہمی کی خدمت انجام دیا کرتے تھے، اس طرح اس نے قرطبہ کے کتب خانے کو کتابوں سے مالا مال کر دیا، حتی کہ اس کے عہد میں اس کتب خانے کی کتابیں چار لاکھ ۴۰۰۰۰۰ جلدوں تک پہنچ گئیں، جیسا کہ مقرّی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (۴) چنانچہ اس کتب خانے کو اس کے قدیم مقام سے جب نئی جگہ منتقل کرنا پڑا، تو اس میں قریب چھ مہینے کا وقت لگا۔

ابن خلدون نے اس کی اس شیفتگی کا تذکرہ یوں کیا ہے:

''کتابوں کی تلاش وجستجو اور تحصیل کے لیے مختلف علاقوں میں تاجروں کو روانہ کر دیا کرتا تھا، کتابیں خریدنے کے لیے ان کے پاس رقم بھیجتا، حتی کہ اس نے اندلس میں کتابوں کا اتنا بڑا سرمایہ جمع کر دیا، جس سے وہ لوگ واقف بھی نہیں تھے، اور نسخہ نویسی، ضبط وتحسین اور تجلید کے ماہروں کو جمع کیا''۔ (۵)

اور مشہور مستشرق مصنف ڈوزی، اس خلیفہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''اسپین کی زمام حکومت اس سے پہلے اس مرتبے کے کسی عالم حکمراں نے نہیں سنبھالی، اور باوجودیکہ اس کے تمام

(۱) تاریخ ابن خلدون: ۲۴۹/۱ (۲) نفح الطیب: ۲۴۹/۱
(۳) ایضاً: ۲۵۶/۱ (۴) ایضاً: ۲۵۷/۱
(۵) تاریخ ابن خلدون: ۱۴۲/۴

اسلاف تعلیم یافتہ تھے، اور سب کتابیں جمع کرنے کے دلدادہ تھے، لیکن کسی نے اس ذوق وشوق کے ساتھ نادر اور قیمتی کتابوں کی تلاش وجستجو نہیں کی تھی، جس طرح حکم نے کی تھی''۔ (۱)

حکم نے ''الأمالی'' کے مصنف ابوعلی قالی سے تعلیم حاصل کی تھی، کتابوں سے اس کی شیفتگی کا یہ حال تھا کہ کتاب شائع ہونے اور اہل علم کی اطلاع سے پہلے اس کو اس کا علم ہوجاتا تھا، اس کو معلوم ہوگیا تھا کہ مشہور ادیب ابوالفرج اصفہانی کوئی بے نظیر کتاب لکھ رہا ہے، اس کے پاس حکم نے ایک ہزار اشرفی بھجوائی، جس کے عوض میں اس نے کتاب کو منظر عام پر لانے سے پہلے بغداد سے اس کا ایک نسخہ روانہ کردیا، یہ کتاب ''الأغانی'' تھی۔

لائبریری سائنس کے عصر حاضر کے ماہر اہل علم نے حکم ثانی کے اس کتب خانے، اس کے کلیکشن، اس کی نادر اور بیش قیمت کتابوں پر کافی گفتگو کی ہے، ان کے خیال کے مطابق حکم ثانی کا یہ مکتبہ عہد وسطی میں دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ سمجھا جاتا تھا، جس کی نسبت قلقشندی نے لکھا ہے کہ:

''وہ سب سے عظیم الشان کتب خانہ تھا''۔ (۲)

حکم کو کتابوں کی فراہمی کے ساتھ، ان کی فن وار تقسیم، کتب خانے کی ترتیب، اور اس کی تزئین وآرائش کا بھی حد درجہ اہتمام تھا، اس نے کئی کمرے نسخہ نویسی، تجلید اور کتابوں کی تزئین وآرائش کے واسطے خاص کر رکھے تھے، جن کے اندر کتابوں پر نقش ونگار بنائے جاتے تھے، انتہائی دقیقہ رسی اور منظّم طریقے سے اس کی متعدد فہرستیں تیار کی گئی تھیں، حتی کہ کتب خانے میں موجود صرف شعری مجموعوں کی فہرست ۴۴/اجزاء میں تھی، جس کی طرف ابن حزم وابن خلدون وغیرہما نے اشارہ کیا ہے، ابن خلدون نے ابن حزم کے حوالے سے لکھا ہے:

''ان فہرستوں کی تعداد جن میں کتابوں کا نام درج ہے ۴۴ ہے، ہر ایک میں بیس اوراق ہیں، ان میں صرف دواوین کا نام درج ہے، کسی دوسری کتاب کا نہیں ہے''۔ (۳)

محمد فرید وجدی نے دائرۃ معارف القرن العشرین میں لکھا ہے کہ:

''ابن خلدون نے ثابت کیا ہے شعری مجموعوں کا نام ۹۸۰ صفحے میں درج کیا ہوا تھا، یہ کتب

---

(۱) المکتبات فی الإسلام، از: محمد ماہر حمادہ: ۱۲۳

(۲) صبح الأعشی: ۴۶۷/۱ (۳) تاریخ ابن خلدون: ۱۴۹/۱

خانہ موضوع کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا تھا، یعنی ہر موضوع سے متعلق کتابوں کی مخصوص فہرستیں تھیں''۔

یہ کتابیں خود حکم کے استعمال اور مطالعہ میں بھی بہ کثرت رہتی تھیں، وہ مطالعہ کے وقت کتابوں کے حواشی یا آخر میں لگے ہوئے سادے کاغذ پر اپنے نوٹ یا ریویو درج کرتا، اور ہر کتاب پر بیش بہا حواشی کا اضافہ کرتا، کتابوں کے مصنفوں کا نام، ان کا لقب، خاندان، قبیلہ، اور ولادت و وفات کی تاریخ اور اس جیسی ادبی و تاریخی معلومات درج کرتا، جس سے دوسرے بیشتر لوگ محروم ہوتے تھے، اس کی باریک بینی اور معلومات کی گہرائی کا یہ حال تھا، کہ بعد میں آنے والے علماء نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس کے یہ حواشی بہت صحیح اور دقیق ہیں، جس کی وجہ سے اہل علم نے ان کی بہت تحسین وستائش اور قدر دانی کی، اور ان کو بہت اہمیت اور قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ (۱)

حکم کی کتابوں سے محبت ظاہری اور دکھاوے کی نہیں تھی، کہ صرف فخر ومباہات کے لیے ان کو جمع اور ان کی قدر دانی کرتا ہو، بلکہ ان سے اس نے بھرپور استفادہ کیا، ماحول نے اس کو اعلی درجے کا تعلیم یافتہ اور کثیر المطالعہ بنا دیا تھا، کتابوں کے ساتھ اس کی شیفتگی اور ان سے اس کے استفادہ پر مؤرخین کا اتفاق ہے، مقرّی نے اس کے علم ومعرفت، دقت نظر اور کثرت مطالعہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شہرت یافتہ عالم تھا، دل کا صاف تھا، ایک بڑی جماعت سے اس نے حدیث سنی ہے، اور بہت زیادہ لوگوں نے اس کو اجازت دی ہے، کتابوں کا عاشق و دلدادہ تھا، شاہانہ عیش وعشرت پر اس نے کتابوں کو ترجیح دی، جس سے اس کے علم میں وسعت اور نظر میں دقت اور معلومات میں پختگی آئی، رجال، اخبار و واقعات اور انساب کے علم میں نہایت بلند رتبہ اور اپنی مثال آپ تھا، حوالوں میں قابل اعتماد تھا، ان الفاظ میں ابن الابار نے اس کا تذکرہ کیا ہے، بلکہ اس سے زیادہ بھی بہت کچھ لکھا ہے...... ......اس کے کتب خانے میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس کو اس نے پڑھا نہ ہو یا اس پر نگاہ نہ ڈالی ہو، خواہ کسی فن کی کتاب ہو، ہر کتاب پر مصنف کا نسب، تاریخ ولادت اور تاریخ وفات لکھتا، اس کے بعد اس کے متعلق ایسی دلچسپ باتیں لکھتا، جو صرف اسی کا حصہ تھیں''۔ (۲)

---

(۱) دراسۃ في مصادر الأدب، از: مکی طاہر احمد: ۶۱

(۲) نفح الطیب: ۳۹۵/۱

حکم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس کے ارکان دولت نے بھی اندلس کے سارے شہروں میں کتب خانے قائم کیے، طلیطلہ کا کتب خانہ عربی کتابوں کی کثرت تعداد کی وجہ سے غیر معمولی شہرت کا حامل تھا، یہ شہر یورپ میں عربی علوم کی اشاعت کے لیے مرکزی مقام کی حیثیت رکھتا تھا، اور ۱۰۵۸ء میں مسلمانوں کے ذریعے اس کی آزادی قرون وسطی کے اندر علم وفن کی تاریخ میں نقطۂ انقلاب سمجھی جاتی تھی، اس کی طرف اشادہ کرتے ہوئے وکٹر روس نے لکھا ہے کہ: ''عیسائیوں کے ساتھ اسلامی علم وفن کے تبادلے کے لیے طلیطلہ ایک فطری مقام تھا''۔[۱]

اس وقت دنیا کے ہر مقام پر عربی بولنے والے ہی تہذیب وثقافت کے اصلی مشعل بردار تھے، مسلمانوں کی کتابیں ہی وہ اہم ذریعہ تھیں جن کے واسطے سے قدیم علوم کی تکمیل ہوئی، اوران کا اس انداز سے ترجمہ ہوا کہ اس نے مغربی یورپ کے شہروں میں علمی بیداری کی لہر پیدا کردی۔[۲]

قرطبہ کا کتب خانہ بھی -بغداد وقاہرہ وغیرہ کے علمی سرمایوں کی طرح- سخت حالات سے دوچار ہوا، حکم کی وفات کے بعد اندلس کے سیاسی انحطاط وانقلاب اور اس کے نتیجے میں اقتصادی ومعاشی زوال- نے علمی وثقافتی سرگرمی کو کمزور کردیا، چنانچہ اس کے بعد رونما ہونے والے فتنوں اور ہنگاموں کے دوران اور خلیفہ ہشام ثالث کے بعد بہت سے اہل علم نے ہجرت کا راستہ اختیار کرلیا، اندلس کی اموی خلافت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی، اور متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی، جس کو تاریخ کی زبان میں ''طوائف الملوکی'' کہا جاتا ہے۔

اسی کے ساتھ حکام کا علمی وثقافتی معیار بھی تنزل کا شکار ہوگیا، جس نے کتابوں کے ذخیروں کے منتشر ہونے میں کلیدی رول ادا کیا، وہاں کی کتابیں پوری طرح ضائع ہوگئیں، اور اندلس اور اس کے علاوہ دوسرے ممالک کے شہروں میں بکھر گئیں۔

کچھ ہی برسوں بعد قرطبہ کو بربروں کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا، جنھوں نے پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) میں شہر کا محاصرہ کرلیا، اس پر حملہ آور ہوئے، اس وقت کچھ کتابیں فروخت کردی گئیں، اور جو باقی بچی تھیں ان کو حملہ آوروں نے برباد اور نذر آتش کردیا۔[۳]

(۱) امان، محمد: الکتب الإسلامیۃ: ۶۵ (۲) ایضاً: ۶۷
(۳) تاریخ ابن خلدون: ۴/۱۴۶

مؤرخین کے اندازے کے مطابق ان اسلامی کتابوں کی تعداد جو اسپین میں پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر اور سولہویں صدی عیسوی کے اوائل میں نذر آتش کی گئیں، تقریباً دس لاکھ تھی۔

یہاں یہ ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ خلفاء کے ان تینوں کتب خانوں کا -بغداد کا عباسیوں کا کتب خانہ، قاہرہ کا فاطمیوں کا کتب خانہ اور قرطبہ کا امویوں کا کتب خانہ- اسلامی علوم وفنون کے بقاوتحفظ میں بہت بڑا کردار تھا، بلکہ عربی میں ترجمہ کے ذریعہ قدیم انسانی سرمائے کے تحفظ میں بھی بڑا ہاتھ تھا۔

یہ کتب خانے تہذیب وثقافت کے عظیم الشان میناروں کی طرح پانچ صدی تک پوری دنیا کے لیے علم وہدایت کے راستوں کو روشن کرتے رہے، حتی کہ پے بہ پے اور یکے بعد دیگرے داخلی شورشوں اور انقلابات نے ان تہذیبی خزانوں کو منتشر کر کے ہواؤں میں اڑا دیا، اسی کے ساتھ بیرونی حملہ آوروں اور ظالموں کی چیرہ دستیوں نے ہماری عظیم الشان اسلامی وانسانی وراثت کے بڑے حصے کو بے نام ونشان کر دیا۔

اسلامی کتب خانوں کی بربادی، صلیبیوں، چنگیزیوں اور تاتاریوں اور ان جیسے دوسرے حملہ آوروں کے ہاتھوں ان کی تاراجی امت اسلامیہ کے اس دور کا سرانجام تھا، جس دور میں علم وفن اور تہذیب وتمدن کی مشعل اس کے ہاتھ میں تھی، اور پوری دنیا کو علم ومعرفت اور ثقافت کی روشنی سے روشن اور منور کر رہی تھی۔

(جاری ہے)

اہل علم کے خطوط بنام حضرت محدث کبیرؒ

(مکاتیب حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

ترتیب: مسعود احمد الاعظمی

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ

۳/ ذیقعدہ ۷۸ھ

حضرت مخدومی محترمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو۔

آج مولانا محمد طیب صاحب کا گرامی نامہ دیوبند سے آیا ہے جس میں مجلس عاملہ کی تاخیر کے اسباب میں یہ بھی ذکر کیا ہے تازہ حادثہ کی وجہ سے جناب غالباً اس وقت نہ آسکیں گے۔

مجھے کسی ایسی بات کا بالکل علم نہیں، حال ہی میں مولانا عبداللطیف صاحب کا ایک گرامی [نامہ] آیا تھا، اس میں بھی کسی بات کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ یہ عریضہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آیا ہے تو اس کا علم ہو جائے، اللہ تعالیٰ اپنے حفظ وامان میں رکھے، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ

۳۰ محرم ۷۹ھ پنجشنبہ

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

مولانا ابوالوفا صاحب کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، آج میں دفتر جمعیۃ العلماء گیا تو معلوم ہوا کہ لہرپور کے قضیہ کی وجہ سے وہ قریباً ایک ہفتہ سے لہرپور میں ہی ہیں اور میں نے خط شاہجہاں پور لکھا تھا، اب میرا اندازہ یہ ہے کہ خط ان کو ملا ہی نہیں، اس لیے اب مبارک پور کا سفر ملتوی ہے۔

یہاں دارالعلوم میں سہ ماہی امتحان کے سلسلہ میں ایک ہفتہ اسباق بند رہیں گے؛ اس لیے میں نے طے کیا ہے کہ انشاء اللہ کل جمعہ کو سہارن پور روانہ ہو جاؤں گا، اس طرح مجھے مجلس سے پہلے قریباً ایک ہفتہ سہارنپور قیام کے لیے مل جائے گا۔

جناب کی تشریف آوری بھی جتنی پہلے سہارنپور ہو سکے اچھا ہے۔

خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ

۲۳؍رجب ۷۹ھ

مخدومی معظمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون

پرسوں شام قاری عبدالعلیم صاحب آئے تھے، اب تک کچھ نہ لکھ سکنے کے اسباب واعذار بتاتے تھے جو کوئی وزن نہیں رکھتے۔ آئندہ کے لیے وہ یہ طے کر کے گئے ہیں کہ ہر تین دن میں ایک جز پورا کر کے دیں گے۔ مسودہ کا ڈیڑھ صفحہ اُن کے ایک صفحہ میں آرہا ہے، اس حساب سے کتاب غالباً دو سو سے آگے نہ جائے گی۔ اور ۲۰۰ صفحہ کی کتابت کے لیے اس حساب سے قریباً چالیس دن درکار ہوں گے، اس طرح اس کا کافی امکان ہے کہ کتاب رمضان میں تیار ہو جائے۔ میری رائے اور گزارش یہ ہے کہ اگر قاری صاحب وعدہ کے مطابق کام کریں تو ۲۰ شعبان کے بعد ایک ہفتہ کے لیے جناب تشریف لے آئیں۔ اگر کاپیاں تیار ہو گئیں تو متفرق پریسوں میں کتاب چھپوائی جا سکتی ہے۔ اور اگر قاری صاحب حسب وعدہ نہ کیا، تو پھر کوئی صورت رمضان میں تیاری کی نہیں ہے۔ قاری صاحب کے طرز عمل کا اندازہ بس ہفتہ عشرہ میں ہو جائے گا۔

مسودہ بس وہی ہے جو جناب مرحمت فرمائے گئے تھے اور اس کے بعد جو اوراق مولانا عبداللطیف صاحب کے ذریعہ آئے تھے، اب باقی مسودہ بھی جلدی آجانا چاہئے۔ میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ اگر قاری صاحب نے کام کیا اور آخر میں ضرورت محسوس ہوئی تو کچھ حصہ کسی دوسرے کاتب کو بھی دینے کی کوشش کی جائے گی؛ لیکن مسلسل کتاب میں یہ تقسیم بڑی مشکل ہوتی ہے، پورا مسودہ آنے پر اس سلسلہ میں غور کیا جاسکتا ہے۔

خدا کرے مزاج بعافیت ہو۔ ڈاکٹر مصطفیٰ صاحب سے ابھی ملاقات نہیں ہوسکی ہے، انشاء اللہ اب کوشش کروں گا، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

از محمد منظور نعمانی

جونپور اور بنارس کے درمیان

۳۰ ستمبر شنبہ

حضرت معظمی محترمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

خدا کرے مزاج گرامی ہر طرح بعافیت ہو۔

اب تو کئی مہینے ہوگئے ہوں گے، جناب کی سفر حجاز سے واپسی کے دو تین ہفتے بعد مولوی سعید الرحمٰن صاحب سے بالکل غیر متوقع طور پر تشریف آوری کی اطلاع مل گئی تھی، اس کے کچھ دنوں کے بعد مجلس شوریٰ کی تاریخیں تھیں، ارادہ کے باوجود عریضہ لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی، خیال تھا کہ شوریٰ کے سفر کے لیے حسب معمول کچھ پہلے لکھنؤ تشریف آوری ہوجائے گی، ایسا بھی نہیں ہوا، پھر مجلس شوریٰ میں بھی تشریف آوری نہیں ہوسکی، پھر اس کے بعد سے اب تک بھی عریضہ نہیں لکھ سکا۔ اس مجرمانہ تقصیر کا اگرچہ میں ہمیشہ کا عادی ہوں، پھر بھی احساس اور اس کی وجہ سے سخت ندامت ہے۔

میں اس وقت دہرہ ایکسپریس سے ٹاٹا نگر جارہا ہوں، وہاں تبلیغی اجتماع ہے۔ یہ ارادہ ہے کہ اگر کسی طرح موقع مل سکے، تو خواہ دو ہی چار گھنٹے کے لیے ممکن ہو مئو حاضر خدمت ہو کر لکھنؤ واپس

جاؤں، پرسوں دوشنبہ کو انشاء اللہ کسی وقت میں وہاں سے روانہ ہوسکوں گا، شاید منگل کے دن دوپہر کو حاضری ہوجائے۔ بدھ کی صبح کو لکھنؤ پہنچ جانا چاہتا ہوں۔

انتظار کی زحمت نہ فرمائی جائے، اگر موقع نکل سکا تو انشاء اللہ حاضر ہوجاؤں گا اور سیدھا مدرسہ پہنچ جاؤں گا۔ چونکہ محض خیال ہے ظن غالب بھی نہیں ہے۔ اس لیے اچھا ہے کہ کسی اور کے علم میں نہ آئے تاکہ کوئی صاحب اسٹیشن جانے کی زحمت نہ فرمائیں، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ - ۷رمئی ۶۴ء

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون۔

خدا کرے مزاج گرامی بخیر وعافیت ہو۔ زیارت وملاقات کو بہت ہی دن ہوگئے۔

۹-۱۰-۱۱ مئی کو جونپور میں تبلیغی اجتماع ہورہا ہے، میں نے یہ سوچا ہے کہ شنبہ یکشنبہ کی درمیانی شب میں یہاں سے روانہ ہوکر سیدھا مئو حاضر ہوجاؤں اور یکشنبہ کی صبح وہاں پہنچ کے ایسے وقت وہاں سے اعظم گڈھ چلا جاؤں کہ شام کو جونپور پہنچ سکوں، اس طرح چند گھنٹے حاضری کا موقع انشاء اللہ مل جائے گا۔ اگر کوئی خاص مانع پیش نہ آیا تو انشاء اللہ ایسا ہی کروں گا، اگر ایسا نہ کرسکا تو پھر جونپور سے فارغ ہوکر دوشنبہ کو انشاء اللہ شام تک حاضر ہوجاؤں گا، والسلام۔

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

لکھنؤ

۲۸راکتوبر ۸۳ء (یوم الجمعہ)

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم وبرکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ مرقومہ ۱۶ محرم ابھی ملا۔ میں نے مولانا علی میاں سے حضرت کے بارے میں دریافت بھی نہیں کیا اور انھوں نے غالباً مجھ کو حضرت کے بارے میں بتلانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اب گرامی [نامہ] سے تشریف نہ لانے کی وجہ معلوم ہوئی۔

جیسا کہ مجلس شوریٰ کے دعوت نامہ سے معلوم ہو چکا ہوگا، اس کی تاریخ ۱۳-۱۴-۱۵/نومبر ہے، چہار باغ مسلم مسافر خانہ کے کمرے مولانا مرغوب الرحمٰن نے ۱۲ سے ۱۵ تک کے لیے رزرو کرائے ہیں، وہ خود بھی انشاء اللہ ۱۲ کی صبح دہرہ اکسپریس سے آجائیں گے۔ حضرت والا بھی ۱۲ ہی کو تشریف لے آئیں، مجھے کچھ تنہائی میں عرض کرنا ہوگا۔ اس کے لیے یا تو صبح کا وقت مناسب ہوگا دس بجے سے پہلے۔ یا پھر سہ پہر کو ۳-۴ بجے، کیونکہ دس بجے غالباً مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب وغیرہ میرے پاس آجائیں گے۔ اور عصر بعد اور مغرب بعد بھی لوگوں کے آنے کا امکان ہے؛ اس لیے اگر تشریف آوری صبح ہو تو ۱۰ بجے کے قریب غریب خانہ پر تشریف لے آئیں ناشتہ چائے یہیں فرمائیں، اور اگر صبح تشریف آوری نہ ہو تو سہ پہر کو قیلولہ کے بعد ۳-۴ بجے کے قریب۔

امید ہے کہ برادر مکرم مولانا رشید احمد صاحب کل ۲۷/اکتوبر کو تشریف لے آئے ہوں گے، ان کی خدمت میں نیز بشرط یاد و سہولت مولانا عبدالجبار صاحب زید مجدہم کی خدمت میں سلام مسنون اور دعا کی درخواست حضرت کی دعاؤں کا بھی طالب ہوں، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

محمد منظور نعمانی

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ-۳/محرم الحرام ۱۴ھ

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم وبرکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو، والا نامہ مورخہ ۱۵ ستمبر موصول ہو گیا تھا۔

اس وقت صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دارالعلوم کے بارے میں بہت تفصیلی

مشاورت کی ضرورت ہے۔اس وقت اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ۲۲/ اکتوبر یوم دوشنبہ کو ندوۃ العلماء کی انتظامیہ کا دعوت نامہ جاری ہوگیا ہے، حضرت کی خدمت میں بھی ان شاء اللہ پہنچے گا، صرف ایک ہی دن کے لیے رکھا گیا ہے، اس میں دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے کئی حضرات ہیں (جو ذہن میں ہوں گے) دارالعلوم کے بارے میں جس طرح کی تفصیلی بات کی ضرورت ہے اُس کا موقع اُس دن یعنی ۲۲ اکتوبر دوشنبہ کو تو نہیں ملے گا؛ اس لیے میری گزارش ہے کہ اگر کوئی خاص مانع نہ ہو تو اس میں شرکت کا ارادہ فرمالیں اور یا تو ایک دن پہلے تشریف لے آئیں، یا اس کے بعد بھی ایک دو دن قیام فرمائیں۔ میرے نزدیک جو بات کرنا ضروری ہے وہ صرف حضرت ہی سے عرض کرنے کی ہے۔ ہاں اگر اُس وقت تک مولانا عبدالحلیم صاحب سفر حج سے واپس تشریف لے آئے، تو ان سے بھی تشریف آوری کی گزارش کروں گا۔

ابھی ذہن میں آیا کہ بہتر یہ ہوگا کہ ندوہ کے جلسہ کے بعد ایک دو دن قیام فرمایا جائے، سفر کا پروگرام اسی حساب سے بنایا جائے۔اس میں راحت بھی رہے گی۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا جلسہ اس کے بعد ہی نومبر میں غالباً ہوگا۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ آئندہ مجلس شوریٰ کے سلسلہ میں بعض خاص امور پر غور وفکر اور مشاورت ضروری ہے۔

خدا کرے کہ مولانا رشید احمد صاحب بعافیت تشریف لے آئیں اور لکھنؤ کا سفر بعافیت ہوسکے۔

دعاؤں کا محتاج اور طالب ہوں، والسلام۔
محمد منظور نعمانی

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

محمد منظور نعمانی
۶/ذی الحجہ ۶ھ
حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم وبرکاتکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عریضہ کے جواب میں والا نامہ موصول ہوکر موجب شرف ہوا۔اس میں حضرت نے اپنے موجودہ مشاغل کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے،اسے پڑھ کر بے حد مسرت بھی ہوئی اور حیرت بھی۔بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ کا خارق عادت فضل وکرم ہے کہ ضعیفی کے اس دور میں اس طرح اور اتنا کام لیا جارہا ہے،ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَاءُ

....

میں نے جو عریضہ لکھا تھا، غالبًا اس میں اپنی بات صحیح طور پر لکھنے سے قاصر رہا، استفتا اور فتوے کے خاص مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے ضروری سمجھا کہ شیعہ اثناعشریہ کے جن عقائد کو ہمارے اکابر علماء متقدمین ومتاخرین نے موجب کفر قرار دیا اور جن کی وجہ سے ان کی تکفیر واجب ہوجاتی ہے، اُن کے بارے میں ان کی بنیادی اور مستند کتابوں سے اتنا مواد استفتا میں پیش کردیا جائے،جس کے بعد ان عقائد کے بارے میں شک شبہہ کی اور اُن کی بنیاد پر شرعی حکم کے بارے میں اختلاف کی گنجائش نہ رہے اور پڑھے لکھے عام مسلمان بھی فتوے کو برحق سمجھیں۔

اس کی وجہ سے استفتا بجائے خود ایک رسالہ ہوگیا اور طے کیا گیا کہ اس کو طبع کرالیا جائے، امید تھی کہ آخر ذیقعدہ تک طبع ہوجائے گا اور اوائل ذی الحجہ میں مولوی سجاد سلمہ اس کو مئو حاضر ہوکر حضرت کی خدمت میں پیش کرآئیں گے۔اور حضرت کو جب فرصت وسہولت ہوگی جواب تحریر فرمادیں گے۔

لیکن کتابت کے لیے جن کاتب صاحب کے سپرد کیا گیا تھا،انھوں نے بہت تاخیر کردی، اب بظاہر عید اضحیٰ کے بعد ہی انشاء اللہ حاضر خدمت ہوسکے گا۔امید ہے کہ حضرت کو جواب کے لیے زیادہ زحمت برداشت کرنی نہ پڑے گی۔ارادہ یہ ہے کہ حضرت کا جواب طبع کراکے استفتا کے ساتھ شامل کرکے تصدیق وتائید کے لیے دوسرے حضرات علماء واصحاب فتویٰ کے پاس بھیجا جائے۔ پاکستان میں خاص طور سے اس کا انتظار ہے،وہاں اس کی اشاعت کی یہاں سے بہت زیادہ ضرورت ہے۔

میری کتاب ’’ایرانی انقلاب خمینی اور شیعیت‘‘ پاکستان میں دولاکھ سے زیادہ طبع ہوکر شائع ہوچکی ہے۔ بقیہ صفحہ ۵۳ پر